هشام غالب

مسرحي الوزير

٢

مقامِ غالبؔ

عبدالصمد صارم الازہری

ناشر ــــــ ادارہ علمیہ ۵ مہنی رام روڈ نئی انارکلی لاہور

بار اول ایک ہزار ــــــ اپریل ۱۹۶۸ء

کاتب ــــــ مقبول احمد بجنوری

مطبع ــــــ نقوش پریس ۔ لاہور

قیمت ــــــ چھ روپے

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

التماس

راست می گویم و یزدان نہ پسندد جز راست
حرفِ ناراست سرودن روشِ اہرمن است

میری کتاب "اردو کا سب سے بڑا شاعر اور محسن"[1] کی تقریظ میں مولانا حسرت موہانی نے تحریر فرمایا تھا۔

"مصحفی کے بعد متوسطین کے دور میں غالب کو نظر انداز کر دیا ہے اور اس کی کوئی وجہ بھی ظاہر نہیں کی ہے۔ فقیر کے نزدیک اردو نظم کے علاوہ اردو نثر کا بھی لحاظ کیا جائے تو غالباً غالب ہی کو اردو زبان کا سب سے بڑا محسن ماننا پڑے گا۔"

مولانا کی اس رائے نے مجھے مرزا غالب پر نظر کرنے کی طرف متوجہ کیا۔ میں نے وہ زمانہ بھی دیکھا ہے جبکہ اکثر فضلاء اور شعراء مرزا غالب کے اکثر اشعار کو مہمل اور بے معنی کہتے تھے پھر وہ وقت آیا کہ بقول ڈاکٹر سید عبد اللطیف غالب[2] پرستی پھیل گئی۔

میں نے مرزا غالب کے دیوان اور ان کے رقعات کے مجموعوں پر غور کیا اور ان کتابوں اور مضامین پر بھی نظر کی جو مرزا غالب کے متعلق شائع ہوئے ہیں

---

[1] اردو کا سب سے بڑا شاعر اور محسن ص۲۳ مطبوعہ انتظامی پریس حیدر آباد دکن ۱۹۴۳ء یہ کتاب شیخ مصحفی کا تذکرہ ہے۔ مولانا نے اس تقریظ میں شاعری کا لفظ چھوڑ کر صرف محسن لکھا ہے اس کی وجہ مولانا کی اس رائے سے ظاہر ہوگی جو انھوں نے غالب سے متعلق اپنی شرح میں لکھی ہے۔

[2] غالب مصنفہ ڈاکٹر عبد اللطیف ص۱۲ مطبوعہ ۱۹۳۲ء دکن پریس۔

اور دیگر اساتذہ کے کلام و حالات کا بھی مطالعہ کیا تو مجھے ثابت ہوا کہ مرزا کے متعلق بھیڑ اچال کی وجہ سے ایک طوفان بپا ہے اور ہماری زبان کی شاعری میں نقائص و اغلاط کا شیوع ہو رہا ہے اور بے حد بد مذاقی پھیل گئی ہے غور کیا جائے تو غالب کے مداحوں نے غالب کو وہ رتبہ عطا کر دیا ہے کہ جس سے آگے الوہیت کا درجہ ہے۔[1]

ڈاکٹر عبد اللطیف لکھتے ہیں۔[2]

"اردو داں طبقہ میں ایک قسم کی بد ذوقی پیدا ہو چلی ہے"۔

سید سلیمان ندوی انتخاب غالب کے ریویو میں لکھتے ہیں :۔

"نسخہ حمیدیہ اور ڈاکٹر بجنوری مرحوم کے مقدمہ کی اشاعت کے بعد سے ایک عام بد مذاقی پیدا ہو گئی ہے"۔[3]

غالب کے خصوصی مداح مولانا غلام رسول مہر رقم طراز ہیں :۔[4]

"وہ (غالب) بیدل کے خاص الفاظ و تراکیب کو بکثرت استعمال کرتے تھے اور اسے بیدل کی پیروی سمجھتے تھے جس طرح آج کل کور ذوق اصحاب نے اشعار میں فارسی اضافتوں کے مسرفانہ استعمال کو غالب کی پیروی سمجھ رکھا ہے۔ ایک صاف اور واضح بات اگر پیچیدہ اور عسیر الفہم ہو جائے تو ان کے نزدیک غالب کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے"۔

درحقیقت ملک میں یہ تیز و تند آندھی چل رہی ہے کہ ہر غلط نویس اور مہمل گو غالب کی نظیریں پیش کر رہا ہے اس لئے میرے علمی فریضہ نے بھی مجھے مجبور

---

[1] دیکھو یادگار غالب و افکار غالب وغیرہ

[2] غالب مصنفہ عبد اللطیف ص ۱۱

[3] رسالہ معارف اعظم گڈھ فروری ۴۵ء

[4] غالب مصنفہ مہر مطبوعہ ۱۹۴۱ء لاہور ص ۲۵۹

کیا کہ میں راست راست بلا کم و کاست بخیال رفع مفاسد اپنی تحقیقات کو ارباب نظر کے سامنے پیش کر دوں۔ دنیا میں آزادی رائے ہر شخص کا حق ہے اور اس میں کسی دوسرے شخص کو دست اندازی کا کوئی حق نہیں ہے اور ہر اہلِ علم پر واجب ہے کہ علوم و فنون میں شائع ہونے والے اغلاط کا اظہار کر دے۔ بالخصوص اُن اغلاط کو ضرور ظاہر کر دینا چاہیئے جو کسی بڑے آدمی سے سرزد ہوئے ہوں۔ ورنہ کچھ عرصہ بعد وہ معائب محاسن کی صورت اختیار کر لیں گے۔ اور علم و ادب کی بربادی کے باعث ہوں گے۔ کسی پر تنقید کرنا کوئی عیب نہیں۔ ہاں کسی کی خواہ مخواہ تنقیص کرنا یا تخریب کرنا برا ہے۔ ہمارے ملک میں ابھی تنقید کا کماحقہٗ رواج نہیں ہوا اس لئے بعض لوگ اسے بُرا سمجھتے ہیں۔ جن مہذب ممالک میں علوم و فنون کا سمند رموجزن ہے تنقید کو بنظر استحسان دیکھا جاتا ہے بلکہ نہایت ضروری خیال کرتے ہیں۔ درحقیقت تنقید نہایت مفید اور کارآمد چیز ہے۔ تنقید انسانوں کو گمراہی سے بچاتی ہے۔ سر عبد القادر لکھتے ہیں۔

"ہندوستان[۵] میں علوم و فنون کی ترقی کی راہ میں ایک روک یہ رہی ہے کہ یہاں خاص فن تنقید کا رواج نہ تھا اور باوجود ترقی کے مختلف خیالات پیدا ہو جانے کے آجتک یہ فن اس ملک میں رائج نہیں ہے۔ آجکل بعض تحریرات میں کہیں کہیں ناقدانہ جھلک نظر آتی ہے۔ مگر ایسی تحریریں ابھی تعداد میں اس قدر کم ہیں اور وہ جھلک بھی ایسی ہی خفیف ہے کہ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس فن کا رواج ہندوستان میں ہو گیا ہے۔ مغربی دنیا کے باشندوں میں جہاں آجکل اور خوبیاں نظر آتی ہیں وہاں یہ بھی ہے کہ لوگ

---

[۵] انتخاب مخزن حصہ سوم۔ کریمی پریس لاہور ص ۳۷ تا ۴۱ پہلا ایڈیشن۔

ہنروروں کے عیب و ہنر کو دیکھتے ہیں ــــ دقت یہ ہے کہ مصنفین اور مطابع اپنی سچی تعریف اور مذمت سننے کے عادی نہیں ــــ غرض افراط و تفریط کی عمل داری رہی ہے اور مذاق میانہ روی سے آشنا ہی نہیں نتیجہ یہ ہے کہ کتاب کی تعریف کر دینا نشانِ دوستی سمجھا جاتا ہے اور نہ کرنا یا اعتراض کرنا علامتِ دشمنی ہے۔ آپ ذرا کسی کتاب میں کوئی نقص بیان کیجئے مصنف کے بیسیوں طرفدار آپ کی پگڑی اتارنے کو کھڑے ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں آپ میں کتاب سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں اس حالت میں آزادی سے تصانیف پر رائے دینے کا بیڑا اٹھانا ایک جہان سے دشمنی پیدا کرنا ہے اور دشمنی بھی وہ جسے خدا واسطے کی دشمنی کہتے ہیں نہ کوئی ذاتی غرض نہ عناد صرف ملک کے علم و ادب اور مذاق کی اصلاح اور منفعتِ عام کی غرض سے تو تنقید لکھی جائے اور جن کے کلام پر تنقید ہو وہ ایسے بگڑیں کہ دل میں غصہ بھر لیں اور بدلہ لینے کی فکر میں رہیں۔

ڈاکٹر زور[۱] لکھتے ہیں۔

"غلط فہمیاں ہمیشہ پیدا ہوتی رہیں گی لیکن ہر قوم کے عالی دماغ صاحبِ دل اور خوش مذاق افراد کا اولین فرض یہی ہے کہ وہ ان کو حتی الامکان دور کرنے کی کوشش کرتے رہیں۔ تنقید کے اصلی مفہوم کو سمجھنے سے نہ صرف ہم کو ہماری وقتیہ بدمزاقیوں نے قاصر رکھا ــــ یہ عجیب بات ہے کہ تنقید کو اکثر ایک مذموم

---

[۱] روحِ تنقید حصہ اول صفحہ ۴۳۔ ابراہیمیہ پریس حیدرآباد دکن ۱۹۳۰ء مصنفہ زور پہلا ایڈیشن۔

حرکت اور بغض و عداوت کا مظہر قرار دیا جاتا ہے۔

مرزا غالب پر اس وقت تک جو کچھ لکھا گیا ہے اس کو تنقید نہیں کہا جا سکتا بلکہ اب تک ان پر کوئی تنقید ہوئی ہی نہیں بلکہ وہ نثر کے مدحیہ قصائد ہیں جو لوگوں نے غالب، حالی اور بجنوری سے مرعوب ہو کر لکھے ہیں کسی نے نقد کی جرات نہیں کی۔ پروفیسر حامد حسن قادری لکھتے ہیں۔

"جو لوگ ان سے (غالب وغیرہ سے) مرعوب ہو گئے تھے انھوں نے کلامِ غالب کو آیت اور حدیث اور ملہم سمجھ کر اس کو معنی پہنانے شروع کر دیئے ــــ سب شارحین میں یہ عجیب بات ہے کہ کوئی صاحب نقد و نظر سے کام نہیں لیتے۔"[۱]

بعض شارحوں مثلاً طباطبائی وحسرت نے بعض بعض جگہ دبی زبان سے کچھ اغلاط کی طرف اشارہ کیا ہے۔ پروفیسر حامد حسن قادری نے اپنی کتاب نقد و نظر میں کچھ جرات کی ہے اور ایک مختصر تنقید لکھی ہے۔ چوں کہ مرزا غالب کی وجہ سے ہمارے ادب میں اغلاط و اسقام کی وبا پھیل رہی ہے اس لئے ضرورت ہے کہ مرزا غالب پر سختی سے تنقید کی جائے۔ ڈاکٹر عبداللطیف لکھتے ہیں۔

"اردو ادب[۲] کی خاطر غالب کے فن و کمال کو صحیح طور پر جانچنے کی کوشش ازبس ضروری ہے۔"

غرض میں نے اپنا علمی فریضہ ادا کرنے کے لئے مرزا غالب پر یہ کتاب لکھی ہے میں جانتا ہوں کہ ملک میں ان لوگوں کی کثرت ہے جنھیں ڈاکٹر عبداللطیف وغیرہ مصنفین نے غالب پرست خطاب دیا ہے لیکن یہ امر مجھے ایسا مرعوب نہیں

---

۱ یہ حوالہ بالتفصیل آگے مرقوم ہے۔
۲ غالب مصنفہ عبداللطیف ص ۱۲

کر سکتا کہ میں اظہارِ حق سے باز رہوں۔

پیشِ دشمن نہ گذر حق سے نہیں سانچ کو آنچ
بلکہ ہے آتشِ نمرود گلستانِ خلیل

میں مرزا غالب کو اردو ادب کے اساتذہ میں سے سمجھتا ہوں اور میرے دل میں ان کا بڑا احترام ہے۔ میں نے حتی الامکان طریق ادب کو ملحوظ رکھا ہے اور بہ راستی کے ساتھ ہر چیز کو ترتیب دیا ہے اس لئے مجھے امید ہے۔

ہوتی ہے سچ کی قدر یہ بے قدریوں کے بعد
اس کے خلاف ہو تو سمجھ اس کو شاذ تو

مرزا غالب کے متعلق جو کچھ اس کتاب میں ہے وہ اکثر مرزا کے مداحوں کی تصانیف سے ماخوذ ہے۔ مرزا کے کسی مخالف کے بیان پر میں نے اعتراضات کی بنیاد قائم نہیں کی ہے۔ ارباب نظر کی خدمت میں التماس ہے کہ بہ نظر انصاف ملاحظہ فرمائیں اگر میری لغزش ثابت ہو تو مطلع فرمائیں بشرطِ معقولیت انشاء اللہ تعالیٰ مجھے اپنی غلطی پر مصر نہ پائیں گے۔ اگر واقعی میری غلطی ہو گی اور صاف دلائل سے اسے ثابت کیا گیا تو مجھے اپنا رجوع شائع کرنے میں عذر نہ ہو گا۔ حوالہ جات حتی المقدور صحت اور تفصیل سے درج کئے گئے ہیں جس کتاب پر سنِ طباعت یا بار اول وغیرہ لکھا ہوا نہیں ہے وہاں صرف مطبع اور صفحہ کا حوالہ لکھا ہے مفصل حوالہ کتب محولہ کا کسی ایک جگہ مکمل ہے۔ باقی صرف نام اور صفحہ لکھا ہے۔ بنظر سہولت اس کتاب کو چار ابواب پر تقسیم کیا ہے۔ باب اول حالاتِ غالب۔ باب دوم غالب کی شاعری کا تاریک پہلو۔ باب سوم غالب کی شاعری کا روشن پہلو۔ باب چہارم نتیجہ۔ اس کتاب میں مرزا غالب کے معایب و محاسن پر ہر پہلو سے منصفانہ نظر کرنے کی کوشش کی ہے۔ ارباب نظر اگر انصاف سے غور فرمائیں گے تو مرزا غالب کی اردو شاعری پر اس کتاب کو ایک جامع اور مفید و منصفانہ تبصرہ پائیں گے۔ میری اس تصنیف کا

تعلق مرزا غالب کی اردو شاعری اور اردو نثر ہے۔ اُن کے ذاتی حالات اور فارسی نظم و نثر سے مجھے بحث نہیں۔ میں نے اعتراضات کو تہذیب کے ساتھ پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ چوں کہ بقول ڈاکٹر عبداللطیف صاحب یہ دور غالب پرستی کا ہے اس لئے میری اس تصنیف کے ساتھ جو سلوک ہوگا مجھے اس کا اندازہ ہے۔ اس کے خلاف مضامین لکھے جائیں گے رسائل و اخبارات تبصرہ کرنے میں کند چھری سے کام لیں گے۔ باوجود اس توقع کے میں یہ عرض کرنا ضروری خیال کرتا ہوں کہ بندہ بشر ہے بھول چوک اس کے خمیر میں ہے اور میں تو ایک پیچمیرز انسان ہوں اگرچہ میں نے احتیاط کی ہے مگر ممکن ہے اغلاط وغیرہ کے بیان میں کوئی کمزوری ہو۔ ایسا نہیں ہونا چاہیئے کہ لوگ ایک دو باتوں کو لے کر کتاب کے نقائص کو اجاگر کرنے کے لئے کمربستہ ہو جائیں بلکہ ہر قسم کے دلائل اور حوالہ جات پر نظر کر کے انصاف کریں۔ اس کتاب کے مطالعہ سے ناظرین پر یہ امر بھی روشن ہو جائے گا کہ میں نے مرزا کے کلام کے محاسن کے اظہار میں کوتاہی نہیں کی ہے بلکہ ان کے کلام کی خوبیوں کو اعتدال کے ساتھ اس طرح ترتیب دیا ہے کہ اُن کے خاص مداحوں کی تصانیف میں بھی ایک جگہ اس طرح مذکور نہیں ہے۔ سب سے پہلے اس طرف نظر ہونی چاہیئے کہ شاعری میں درستی و صحتِ زبان، ضوابط و قواعد کا ہونا ضروری ہے یا نہیں اگر ضروری ہے تو جو اسقام مرزا کے کلام میں دکھائے گئے ہیں وہ واقعی اسقام و نقائص ہیں یا نہیں اور اُن کے کلام میں موجود ہیں یا نہیں۔ اگر یہ تمام امور درست ہیں تو پھر اس کتاب کا مقصد صحیح ہے ورنہ انہی امور کو دلائل سے رد کرنا چاہیئے۔ میں نے اس کتاب کے ہر بیان کے متعلق مشہور مبصرین کی رائیں نقل کی ہیں میں کسی خیال میں منفرد نہیں ہوں۔

میرا عقیدہ ہے کہ اغلاط کا شائع ہونا اور ان پر قائم رہنا بھی

انسان کی شناخت اعمال سے ہوتا ہے اس لئے میں خداوند ذوالجلال سے دعا کرتا ہوں کہ اگر اس میں مجھ سے کوئی لغزش ہوئی ہے تو معاف فرمائے اور میرے اغلاط کو مجھ پر واضح اور روشن فرما کر مجھے رجوع کی توفیق عطا فرمائے۔

عبد الصمد صارم
۱۹۶۸ء

۷۸۶

باب اوّل

حالاتِ غالبؔ

اس بیان میں مرزا غالب کے اسی قدر حالات اختصار سے لکھے جائیں گے جن کی اس کتاب کے مضامین کے لئے ضرورت ہے واقعات اور حالات اور سنین کے لکھنے میں غالب مصنفہ مہر مطبوعہ ۱۹۴۱ء و ذکرِ غالب مصنفہ مالک رام مطبوعہ مکتبہ جامعہ دہلی ۱۹۳۸ء کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ کیونکہ ان مصنفین نے اکثر سنین و واقعات کے متعلق مرزا غالب کی تصانیف کے حوالے دیئے ہیں اور ان کے بیان کردہ واقعات و سنین میں اور مصنفوں کو بھی اختلاف نہیں جو واقعہ کسی کتاب سے لیا ہے اس کا حوالہ لکھ دیا ہے۔

مرزا غالب

۸ رجب ۱۲۱۲ھ ہجری مطابق ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء کو آگرہ میں پیدا ہوئے تاریخ ولادت لفظ (غریب) ہے۔ اسد اللہ خاں نام اور مرزا نوشہ لقب رکھا گیا۔ ان کے والد کا نام مرزا عبد اللہ بیگ، عرف مرزا دولہا تھا۔ یہ ترکی قبیلہ ایبک تھے جو مرزا کے دادا شاہ عالم ثانی کے زمانہ میں سمرقند سے دہلی آئے تھے ۱۸۰۲ء کو انتقال ہو گیا۔ مرزا غالب کے چچا بھائی کے کفیل ہوئے ۱۸۰۶ء میں ان کا بھی انتقال ہو گیا۔ اب گھر میں سوائے بیواؤں اور یتیموں کے کوئی نہ رہا۔ مقررہ جاگیر یا پنشن میں سے جو کچھ دیتے تھے

ناچار بیکسوں کو وہی قبول کرنا پڑتا تھا۔ جب مرزا نے ذرا ہوش سنبھالا تو آگرہ کے ایک معلم مولوی معظم کے مکتب میں پڑھنے کے لئے بٹھا دیئے گئے بعض نے لکھا ہے کہ آگرہ کے مشہور شاعر اور معلم نظیر[1] اکبرآبادی سے بھی کچھ پڑھا ہے۔

مرزا غالب[2] نے سات برس کی عمر سے دہلی میں اپنے رشتہ داروں میں آنا جانا شروع کیا۔ گیارہ برس کی عمر سے شاعری شروع کی۔ اسد تخلص کیا۔ جب مرزا کی عمر پورے[3] تیرہ سال کی ہوئی تو ان کی شادی اگست ۱۸۱۰ء میں نواب الٰہی بخش خاں معروف دہلوی کی دختر سے ہوئی۔ اس رشتے سے دہلی میں آمد و رفت زیادہ ہونے لگی۔ شادی سے دو سال بعد دہلی میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔

۱۸۲۸ء میں اسد[4] کی جگہ غالب تخلص اختیار کیا۔ ۱۸۵۰ء میں ظفر بہادر شاہ نے خاندان تیموریہ کی تاریخ لکھنے پر بمشاہرہ پچاس روپیہ ماہوار ملازم رکھا اور نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ خطاب دیا۔ ۱۸۵۳ء سے واجد علی شاہ بادشاہ اودھ نے بھی پانسو روپیہ سالانہ مقرر کر دیا۔ ۱۸۵۴ء میں استاد ذوق کا انتقال ہوگیا تو ظفر بادشاہ نے ان کی جگہ انھیں اپنا استاد بنالیا۔ ۱۸۵۷ء سے نواب یوسف علی خاں

---

۱ رسالہ ہندوستانی الٰہ آباد جنوری ۳۴ء

۲ چوں کہ مرزا غالب کے اکثر معاملات و حالات میں متضاد و مختلف بیانات ہیں اس لئے ان کی تعلیم و تلمذ شاعری قیام دہلی کے متعلق ہم علیحدہ علیحدہ لکھیں گے۔

۳ اگست ۱۸۱۰ء میں مرزا کی عمر بارہ سال اور کم و بیش آٹھ ماہ تھی۔

۴ آب حیات ذکر غالب۔

والی رام پور[لہ] نے سو روپیہ ماہوار مقرر کر دیا۔ مہاراجگان الور، جے پور، پٹیالہ، گوالیار نے بھی انعام و اکرام سے سرفراز کیا۔ ۱۸۵۸ء میں مرزا نے کوئن وکٹوریہ سے درخواست کی کہ انھیں کوئن پوئٹ یعنی شاہی شاعر مقرر کیا جائے مگر یہ درخواست منظور نہ ہوئی۔ ۱۵ر فروری ۱۸۶۹ء مطابق ۳ ذی قعدہ ۱۲۸۵ھ روز دوشنبہ کو دہلی میں مرزا کا انتقال ہو گیا۔ کوئی صلبی اولاد نہیں چھوڑی۔ مرزا غالب کی سوانح عمریوں اور ان کے حالات پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پندرہ سولہ برس کی عمر تک تو وہ بے فکر اور خوش حال رہے اس کے بعد وہ آخر دم تک مبتلائے مصائب و آلام رہے۔ مدتوں تک پنشن وغیرہ کے بند ہونے سے تنگ دست اور پریشان رہے اولاد اور اعزہ کے مرنے کے صدمات بھی ان کو بہت پہنچے۔ درحقیقت ان کی زندگی کا زیادہ حصہ مصیبت کی زندگی تھا وہ بہت صابر اور متحمل تھے۔ تمام مصائب کے زمانے کو ہنس کھیل کر گزار گئے۔ کشادہ دست اور آشنا پرست تھے۔ اگرچہ ان کی کوئی صلبی اولاد زندہ نہیں رہی لیکن معنوی اولاد یعنی ان کی علمی تصانیف سے ہمیشہ ان کا نام روشن اور زندہ رہے گا۔

رہتا سخن سے نام قیامت تلک ہے ذوق
اولاد سے تو ہے یہی دو پشت چار پشت

[لہ] نواب یوسف علی خاں صاحب بچپن میں دہلی میں رہتے تھے تو انھوں نے مرزا سے اور مولوی غیاث الدین صاحب غیاث اللغات سے فارسی پڑھی تھی نواب صاحب نے اپنے عہد حکومت میں دونوں کی قدر کی مگر شاعری میں انھوں نے مرزا سے کم اصلاح لی۔ صاحب آثار غالب نے بھی یہی لکھا ہے کہ نواب صاحب زیادہ تر امیر لکھنوی سے اصلاح لیتے تھے۔

مرزا غالب کی تعلیم اور اساتذہ

آگرہ میں مرزا غالب نے شیخ معظم اور نظیر اکبر آبادی سے علم حاصل کیا۔ آزاد اور حسرت اور دوسرے تذکرہ نویسوں نے ایک پارسی عالم ہرمزد[1] کو بھی غالب کا استاد لکھا ہے غالب نے خود بھی لکھا ہے کہ میں نے ہرمزد سے علم حاصل کیا لیکن آخر زمانہ میں انھوں نے اپنے اس استاد ہرمزد کے وجود اور اس کے تلمذ سے انکار کیا ہے۔ لکھا ہے۔

"جب[2] مجھ کو لوگ بے استاد کہنے لگے تو میں نے ان کا منھ بند کرنے کیلئے ایک فرضی نام گھڑ لیا مجھ کو مبدء فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں۔"

مرزا کی اس تحریر سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کا کوئی استاد پارسی ہرمزد نہ تھا مگر اس زبردستی کو دیکھیے کہ نظامی بدایونی نکاتِ غالب میں مرزا کی عبارت محولہ کو نقل کرکے حاشیہ لکھتے ہیں[3]۔

"کہ یہ مرزا نے از راہ ظرافت لکھا ہوگا عبدالصمد ضرور ایک پارسی عالم نو مسلم تھا۔"

کیا تماشا ہے کہ صاحب معاملہ کتنی نکار رہے اور وہ بلا تکلف وتصنع بیان کر رہا ہے لیکن کم و بیش پچھتر برس کے بعد نظامی صاحب کو اصرار ہے اور وہ اس کو بلا دلیل ظرافت قرار دیتے ہیں۔ لکھتے تو ہیں کہ عبدالصمد ضرور پارسی عالم تھا مگر کوئی حوالہ نہیں دیتے کہ اس عبدالصمد کے وجود وحالات کا انھیں کہاں سے پتہ چلا جس طرح وہ اس اخیر زمانہ کے قول کو ظرافت قرار دیتے ہیں اس سے

---

[1] لکھا ہے کہ ہرمزد مشرف باسلام ہوا اور اس کا نام عبدالصمد رکھا گیا۔
[2] غالب صد ۲۳ مصنفہ ڈاکٹر عبداللطیف ترجمہ سید معین الدین ایم۔اے مطبوعہ دکن لا رپورٹ پریس حیدرآباد دکن [3] نکاتِ غالب حاشیہ صد ۲ مطبوعہ نظامی پریس بدایوں پہلا ایڈیشن مصنفہ نظامی بدایونی۔

زیادہ قوی بلکہ قطعی یہ امر ہے کہ پہلا قول بات بنانے کے لئے تھا حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ مرزا صاحب کو اپنے نسب اور کمال پر غرور تھا نظیر کے تلمذ سے اپنی کسرِ شان سمجھ کر ابتدائی زمانے میں ایک زبردست عالم فرض کر کے اپنا استاد قرار دیا کہ لوگ انھیں بے استادا کہنے سے باز رہیں جب وہ خود خوب روشناس ہو گئے تو انھوں نے امرِ حق کا اظہار کر دیا۔ شیخ معظم زیادہ مشہور نہ تھے نظیر ضرور مشہور تھے لیکن اُس زمانہ میں لوگ ان کو اچھے اساتذہ میں شمار نہ کرتے تھے اس لئے مرزا کو ان کا نام لیتے ہوئے شرم آئی اور ایک فرضی استاد گھڑنے کی ضرورت ہوئی۔ نظامی صاحب نے غور نہیں کیا کہ ان کی اس حاشیہ آرائی سے ان کے ممدوح مرزا غالب پر کیا دھبہ آتا ہے۔ پہلا قول کذب و افترا ہے اور دوسرا تمسخر اور دروغ۔

مہر صاحب لکھتے ہیں۔

"شاعری میں غالب کو کسی سے تلمذ نہ تھا مُلّا عبدالصمد سے فارسی پڑھی اور اس کے قواعد سیکھے"[۱]

مرزا غالب نے جس موقع پر اس کا ذکر کیا ہے وہ شاعری سے متعلق ہے کیوں کہ لوگ انھیں شاعری میں بے استادا کہتے تھے اسی وجہ سے انھوں نے عبدالصمد نام تصنیف کیا معمولی تحصیلِ علم کے متعلق تو کوئی بحث اور طعن تھا ہی نہیں پھر آخر میں جو انکار کیا اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ شاعری کے متعلق لکھتے ہیں کہ مجھے مبدء فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ اساتذہ شعراء شاگردوں کو بعض کتابیں پڑھا دیتے ہیں۔

اگر بقول مہر صاحب کے مُلّا عبدالصمد کا تعلق صرف تعلیم فارسی سے سمجھا جائے تو مرزا صاحب کے اس لکھنے کا کہ مجھے مبدء فیاض کے سوا

---

[۱] غالب مصنفہ مہر ص ۳۱ مطبوعہ ۱۹۴۱ء پہلا ایڈیشن لاہور

کسی سے تلمذ نہیں یہ مطلب ہوگا کہ انھوں نے کسی سے علم حاصل نہیں کیا۔ کیا ان کو خدا کی طرف سے الہامی علم عطا ہوا تھا یعنی علم لدنی۔

سو یہ مقصد نہ مرزا صاحب کا ہو سکتا ہے اور نہ ہر صاحب کا اور نہ کوئی اس کو مان سکتا ہے۔ باقی مبدء فیاض سے ہر شاعر کو تلمذ ہوتا ہے۔ قدرت شعر گوئی کی قابلیت شاعر کی فطرت میں ودیعت کرتی ہے اسی وجہ سے شعراء کو تلامیذ الرحمن کہا جاتا ہے۔ اس میں مرزا صاحب کی کچھ خصوصیت نہیں ہے۔

مرزا غالب کی علمیت

آج ہندوستان میں جو درجہ انگریزی کو حاصل ہے ۱۸۵۷ء تک وہی رتبہ ہندوستان میں فارسی کا تھا ہر شخص بلا قید قوم و مذہب فارسی میں کمال حاصل کرنے کی سعی کرتا تھا اور اس زمانے میں جن علوم کی ضرورت تھی اور جن کو لوگ حاصل کرتے تھے وہ سب فارسی میں موجود تھے۔ اساتذہ تلامیذ کو ایک ایک دو دو کتابیں ہر علم و فن کی پڑھا دیتے تھے۔ تاریخ، طب، نجوم، فلسفہ وغیرہ تمام علوم داخل کورس تھے۔ اس زمانے کے جس اہلِ کمال کو دیکھئے وہ ان علوم کا واقف ثابت ہوگا۔ میری نظر سے کوئی کتاب ایسی نہیں گزری جس پر میں وثوق کر کے کہہ سکوں کہ مرزا غالب نے کیا کیا علوم و فنون کس کس استاد سے حاصل کئے تھے۔

نیاز فتحپوری نے ان کی تعلیم کے متعلق جو رائے ظاہر کی ہے وہ قرینِ قیاس ہے۔

"غالب[۵] پانچ سال کی عمر میں یتیم ہو گئے تھے اور کم سنی میں ان کے

---

[۵] نگار جنوری ۱۹۴۶ء

چچا اور تنہا مربی کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس لئے ظاہر ہے کہ ان کی تعلیم و تربیت نہ ہوئی ہوگی۔

مرزا غالب دہلی میں

مسٹر مالک رام نے ذکرِ غالب میں لکھا ہے کہ مرزا غالب کا دہلی میں آنا جانا سات برس کی عمر سے تھا اس لیے بروئے حساب ۱۸۰۴ء سے دہلی میں ان کی آمد و رفت ہوئی۔ اگست ۱۸۱۰ء میں ان کی شادی ہوئی۔ اس تعلق سے آمد و رفت کا سلسلہ اور بھی بڑھ گیا ہوگا۔

پھر اسی کتاب میں لکھتے ہیں کہ شادی سے دو سال کے بعد انھوں نے دہلی میں مستقل سکونت اختیار کر لی اس لئے ستمبر ۱۸۱۲ء میں ان کا دہلی میں سکونت کرنا ثابت ہوا۔ آگے مرزا غالب کی کتاب درفشِ کاویانی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ مرزا صاحب فرماتے ہیں۔

"ملا عبد الصمد[1] ۱۲۲۶ھ مطابق ۱۸۱۰-۱۱ء میں وارد اکبر آباد ہوئے۔ اور میں نے دو برس انھیں اپنے ہاں مہمان رکھا۔"

اس حساب سے ۱۸۱۳ء تک ان کا آگرہ میں رہنا ثابت ہوتا ہے مرزا غالب کا ۱۸۱۳ء سے قبل آگرہ چھوڑنا اور دہلی میں سکونت اختیار کرنا کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا۔ انھوں نے خود لکھا ہے۔

"ایک[2] کوٹھے پر میں پتنگ اڑایا کرتا تھا اور راجہ بلوان سنگھ سے پتنگ لڑا کرتے تھے۔"

مہاراجہ بلوان سنگھ حسب شرائط گورنمنٹ ۱۸۱۳ء میں آگرہ میں آ کر رہے اس لئے مرزا غالب کا دہلی کو نقل سکونت کرنا جلدی سے جلدی ۱۸۱۴ء میں ہو سکتا ہے تو اس وقت

---

[1] ذکرِ غالب صـ ۲۳ [2] ذکرِ غالب صـ ۱۱ بحوالہ اردوئے معلیٰ

مرزا کی عمر کا سترھواں سال ہوگا۔ اس تعین کی تصدیق ایک اور طرح سے بھی ہوتی ہے۔ مہر صاحب لکھتے ہیں[۱]۔

"ملا عبدالصمد ۱۲۲۶ھ میں آگرہ میں آئے جبکہ غالب کی عمر نے صرف چودہ بہاریں دیکھی تھیں"

یہ پہلے مذکور ہو چکا ہے کہ مرزا غالب نے ملا عبدالصمد کا دو سال آگرہ میں مہمان رکھنا بیان کیا ہے۔ اس سے مرزا غالب پورے سولہ سال کی عمر تک آگرہ میں رہے اور سترھویں سال انھوں نے نقلِ سکونت کی۔ یہ سال ۱۲۲۸ھ/۱۸۱۳ء تھا۔ صاحبِ آثارِ غالب نے لکھا ہے کہ مرزا غالب جب دہلی آئے تو عبدالصمد ساتھ تھے لیکن کوئی حوالہ پیش نہیں کیا مرزا غالب کے متعلق جو کوئی کتاب یا مضمون لکھتا ہے اپنی طرف سے کچھ نہ کچھ اضافہ ضرور کر دیتا ہے۔ مالک رام صاحب وغیرہ کے بیانات سے ثابت ہے کہ مرزا نے پندرہ سولہ سال کی عمر میں دہلی میں مستقل سکونت اختیار کی لیکن پروفیسر آغا حیدر حسن صاحب لکھتے ہیں۔

"ستائیس اٹھائیس برس کے اس وقت ہوں گے"

میرے نزدیک یہی صحیح ہے کیوں کہ ان کے خسر معروف کے کوئی بیٹا نہ تھا۔ غالبؔ معروف کی وفات پر جو ۱۲۴۲ھ میں واقع ہوئی۔ مرزا آگرہ سے آکر دہلی میں ان کے جانشین ہوئے یا انھوں نے اخیر وقت میں کمالِ ضعیفی کی وجہ سے ان کو دہلی بلا لیا ہو اس وقت ان کی عمر تیئس تیس برس ہوگی۔

تخلص

جس طرح مرزا غالب کے کلام میں پیچیدگی ہے اسی طرح ان کے حالات و واقعات میں بھی پیچیدگی ہے منجملہ ان کے تخلص کا بھی ایک قصہ ہے۔ وہ دو تخلص مقرر کرنا کوئی عیب

---

[۱] غالب مصنفہ مہر صفحہ ۵۶ [۲] سالنامہ رسالہ آجکل ۱۹۴۷ء مطبوعہ دہلی

نہیں بعض اساتذہ نے ایسا کیا ہے۔ پہلے وہ اسد تخلص کرتے تھے پھر ۱۲۴۵ھ سے غالب تخلص بھی اختیار کیا۔ اس کے متعلق آب حیات میں آزاد صاحب لکھتے ہیں۔

"جستجو میں کوئی فرومایہ سا شخص اسد تخلص کرتا تھا۔ ایک دن اس کا مقطع کسی نے پڑھا۔

اسد تم نے بنائی یہ غزل خوب
ارے او شیر رحمت ہے خدا کی

سنتے ہی اس تخلص سے جی بیزار ہوگیا کیوں کہ ان کا یہ قاعدہ بھی تھا کہ عوام الناس کے ساتھ مشترک حال ہونے کو نہایت مکروہ سمجھتے تھے چنانچہ ۱۲۴۵ھ ۱۸۲۹ء میں اسد اللہ خالب کی رعایت سے غالب تخلص اختیار کیا لیکن جن غزلوں میں اسد تخلص تھا انہیں اسی طرح رہنے دیا۔"

اسد تخلص سے جی بیزار ہو جاتا تو پھر اس کو استعمال نہ کرتے۔ حالاں کہ یہ امر مسلمہ ہے کہ مرزا غالب نے سادہ رنگ آخر عمر میں اختیار کیا۔ بعض سادہ غزلوں میں اسد تخلص موجود ہے اس لئے بیزاری کا خیال کرنا صحیح نہیں۔ ابتدائی زمانے کے کلام میں غالب تخلص موجود ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ دونوں تخلص رکھتے تھے جو جہاں بندھ گیا باندھ دیا۔ ایک صاحب نے اس روایت کو اس طرح لکھا ہے کہ کسی نے مرزا غالب سے کہا کہ یہ شعر کیا آپ کا ہے۔

اسد ان بتوں کی جفا پر وفا کی
مرے شیر شاباش رحمت خدا کی

مرزا صاحب نے فرمایا کہ اگر ایسا شعر میرا ہو تو مجھ پر لعنت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ شعر میر امانی اسد تخلص شاگرد مرزا سودا کا ہے اور اس طرح ہے۔

اسد اس جفا پر بتوں سے وفا کی
مرے شیر شاباش رحمت خدا کی

بہت عمدہ شعر ہے اساتذہ نے اس کو انتخاب میں لیا ہے۔ شیخ مصحفی نے تذکرہ ہندی

میں اس کو انتخاب میں لیا ہے اور میرزا مانی نے اسد کے متعلق لکھا ہے۔

"دیوانے ضخیم ترتیب دادہ در قصائد و غزل و مثنوی ماہر"

یہ میرزا مانی اسد[۱] ۱۲۰۹ھ میں فوت ہوئے۔ شیخ مصحفی کے بیان سے ایسا ہی مترشح ہوتا ہے۔

اشتراک حالی کی کیفیت یہ ہے کہ غالب تخلص ایک شاعر ولی کے ہمعصروں میں دکن میں گزرا ہے۔ اور شیخ اسد اللہ[۲] المتخلص غالب الہ آباد میں ایک شاعر ہوئے ہیں جو ۱۱۶۳ھ میں فوت ہوئے۔

اور مکرم الدولہ بہادر بیگ خاں ابن نثار بیگ خاں (شاگرد ہدایت) کا بھی تخلص غالب تھا۔ یہ فارسی اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے ۱۲۱۸ھ میں وفات پائی۔

دہلی میں نواب سید الملک اسد اللہ خاں بہادر امام جنگ غالب المتوفی ۱۱۹ھ بھی شاعر تھے ان کا یہ شعر ہے۔

عجب کیا ہے اگر اشک گریں ایسے میری آنکھوں سے

کہ روتا ہے دل پُرشور آتش بار پہلو میں

غرض وہ میرزا تخلص مقرر کرنے میں کچھ حرج نہ تھا لیکن اس کے متعلق کوئی روایت گھڑنا اس سے غرض سوائے بیجا تعلی کے اور کچھ نہیں ہو سکتی

مرزا غالب کا مذہب

مرزا کا آبائی مذہب سنت وجماعت تھا لیکن مرزا کے کلام اور خطوط وحالات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ کلمہ گو مسلمان ضرور تھے مگر کسی مسلک کے پابند نہ تھے جیسی ضرورت دیکھتے بن جاتے تھے۔ انھوں نے قلعہ میں باریابی کی کوشش کی

---

[۱] سرو آزاد صفحہ ۲۲۲ [۲] تذکرہ گلزار ابراہیم مصنفہ میرزا علی سنہ ۱۹۳۴ء ۔

جب کامیاب نہ ہوئے تو یہ تدبیر کی کہ ظفر بادشاہ کے مرید ہو گئے بادشاہ کے عقاید کیا تھے۔ بادشاہ مولانا فخرالدین چشتی دہلوی کے سلسلہ میں مرید تھا۔ تقاریظِ فخریہ وغیرہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا پکے سنی تھے۔

جب مرزا نے واجد علی شاہ سے تعلق پیدا کرنا چاہا اور ادھر رام پور میں نواب یوسف علی خاں مسند نشین ہوئے تو مرزا علی علی کرنے لگے۔ اس زمانے کے ان کے جس قدر خطوط وغیرہ ہیں سب شیعیت سے لبریز ہیں۔ یادگارِ غالب میں مرزا کا ایک خط نقل کیا گیا ہے جو مولوی حمزہ خاں کے نصیحت نامہ کے جواب میں ہے۔ اس میں مرزا نے جو عقائد لکھے ہیں وہ تمام شیعہ عقائد ہیں ان کی بعض عبارتوں اور اشعار میں تبرا کی بھی جھلک ہے اور اصحاب پر طعن بھی ہے

زا جا مے چہ گوئی بہ علی باز گراے

مہ جائے نشین مہر باشد نہ نجوم

یہ مضمون کٹر شیعہ کے سوا اور کوئی نہیں لکھ سکتا۔ نیز لکھتے ہیں۔

غالب نام آورم نام نشانم مپرس

ہم اسداللہیم ہم اسداللہیم

جب یوسف علی خاں مر گئے اور نواب کلب علی خاں والی ریاست ہوئے تو چونکہ یہ سنی المذہب تھے تو مرزا صاحب کہنے لگے۔

شیعہ کیونکر ہو ماوراءالنہری

اس مصرعہ سے اور مرزا کی تجہیز و تکفین کے واقعہ سے بعض لوگ استدلال کرتے ہیں کہ وہ سنی تفضیلی تھے لیکن جو شعر ہم نے نقل کیا ہے اور جس خط کا حوالہ دیا ہے وہ تفضیلی سنی کا نہیں ہو سکتا بلکہ ایک راسخ العقیدہ شیعہ ہی کا ہو سکتا ہے۔

رہا تجہیز و تکفین کا معاملہ سو وہ ان کے اعزا نے ان کی آبائی مسلک کے مطابق کیا۔

والد صاحب نے بیان کیا ہے کہ ۱۸۹۹ء میں اخ مکرم حافظ حاجی محمد ابراہیم صاحب مرحوم دہلی میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ قراش زمانہ میں مرزا اکبر بیگ کے مکان میں رہتے تھے۔ اسی زمانے میں دہلی گیا۔ مرزا اکبر بیگ کہنہ سال بزرگ وجیہہ اور صاحب استعداد آدمی تھے شام کو دیوان خانے میں بیٹھتے دوست احباب آجاتے مختلف قسم کی باتیں ہوتیں ایک دن مرزا غالب کے مذہب کا ذکر ہوا تو مرزا اکبر بیگ نے کہا کہ جعفر علی دہلوی نے مرزا غالب پر یہ چوٹ کی تھی۔

سب اُسے جانتے ہیں وہ ہے رکابی مذہب
اس کو لا تریح کوئی دے گا تو وہ ڈھل جائے گا

(یہ جعفر علی مولوی سید احمد صاحب فرہنگ آصفیہ کے پھوپھا تھے)

مرزا غالب کی شاعری کی ابتدا

مرزا غالب کی ایک عبارت سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ ان کی شاعری کی ابتدا پندرہ برس کی عمر سے ہے۔

"پندرہ[۱] برس کی عمر سے پچیس برس کی عمر تک مضامین خیالی لکھے گئے"

دوسری جگہ لکھتے ہیں[۲] کہ گیارہ برس کی عمر سے شاعری کا آغاز ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر عبداللطیف کی تحقیق یہ ہے کہ غالب نے پندرہ سال کی عمر یعنی تقریباً ۱۸۱۱ء سے اردو میں غزل لکھنی شروع کی۔ ڈاکٹر صاحب کی اس رائے

---

۱ غالب مصنفہ عبداللطیف ص ۲۸۹ ۲ غالب مصنفہ عبداللطیف ص ۲۷

کو قبول کرنے میں عقلِ سلیم کو تردد نہیں ہو سکتا۔ مرزا صاحب کا کبھی گیارہ اور کبھی پندرہ فرمانا قابلِ وثوق نہیں کیونکہ ہر مزدِ پارسی کے معاملہ سے ثابت ہے کہ وہ حسبِ موقع کبھی کچھ کبھی کچھ لکھنے کے عادی تھے۔ ان کے دیگر معاملات میں بھی ان کے بیانات کا تضاد ثابت ہے۔ جن کو مہر صاحب نے اپنی کتاب میں سہو و نسیان کی سپرد کیا ہے۔

خیر مرزا صاحب نے تو گیارہ سال سے آغاز کا دعویٰ کیا ہے مگر ان کے مداح مالک رام صاحب نے اس پر اضافہ کیا ہے لکھتے ہیں۔

"ابھی[۱] وہ مولوی معظم کے مکتب میں پڑھتے تھے کہ ان کی عمر دس برس سے متجاوز نہ تھی کہ انھوں نے شعر کہنا شروع کیا۔"

مرزا صاحب کے دوسرے مداح مہر صاحب نے ایک اور لمبا قدم بڑھایا ہے اور لالہ کنہیا لال کی پوتھی میں سے ایک دستاویز بھی نکال کر ثبوت میں پیش کر دی ہے۔

پہلے لکھتے ہیں۔

"ابتدا[۲] میں اردو میں شعر کہنے شروع کئے تھے۔ گیارہ برس کی عمر میں شعر گوئی کا آغاز ہو گیا تھا۔"

آگے لکھتے ہیں

"آگرہ[۳] کے ایک صاحب لالہ کنہیا لال جو غالب کے ہم عمر تھے ایک مرتبہ دہلی آئے اور غالب سے بھی ملے۔ اثنائے گفتگو میں یاد دلایا کہ آپ نے پتنگ بازی کے متعلق اردو میں ایک مثنوی لکھی تھی۔

---

۱ ذکرِ غالب صفحہ ۲۱ مصنفہ مالک رام پہلا ایڈیشن جامعہ ملیہ دہلی ۱۹۵۵ء

۲ غالب مصنفہ مہر صفحہ ۵۳

۳ غالب مصنفہ مہر صفحہ ۵۲

حاشیہ پر لکھتے ہیں۔

لالہ کنہیالال کا بیان ہے کہ یہ مثنوی جب لکھی تھی تو غالب کی عمر آٹھ نو برس سے زیادہ نہ تھی۔

اب پتنگ کی مثنوی کو دیکھئے جو ہشت سالہ معصوم کی تصنیف ہے زبان کس قدر صاف ہے طرز ایسا اچھا کہ نظیر اکبر آبادی کے کلام سے ٹکر کھاتا ہے۔ یہ معصوم صفت رعایت لفظی سے بھی خوب واقف ہے۔ ہر مصرعہ میں اس کے نبھانے کی کوشش کی ہے فارسی ترکیبیں بھی صحت کے ساتھ استعمال کی ہیں۔

مثنوی پتنگ

ایک دن مثل پتنگ کاغذی　　لے کے دل سر رشتۂ آزادگی
خود بخود کچھ ہم سے کنیانے لگا　　اس قدر بگڑا کہ سر کھانے لگا
میں کہا اے دل ہوائے دلبراں　　بس کہ تیرے حق میں رکھتی ہے زیاں
پیچ میں اس کے نہ آنا زینہار　　یہ نہیں ہیں گے کسی کے یار غار
گورے پنڈے پر نہ ان کے کر نظر　　کھینچ لیتے ہیں یہ ڈورے ڈال کر
اب تو مل جائے گی ان سے تیری سانٹھ　　لیکن آخر کو پڑے گی ایسی گانٹھ
سخت مشکل ہو گا سلجھانا تجھے　　قہر ہے دل ان سے الجھانا تجھے
یہ جو محفل میں بڑھاتے ہیں تجھے　　بھول مت اس پر اڑاتے ہیں تجھے
ایک دن تجھ کو اڑا دیں گے کہیں　　مفت میں ناحق کٹا دیں گے کہیں
دل نے سن کر کانپ کر کھا پیچ و تاب　　غوطہ میں جا کر دیا کٹ کر جواب

رشتۂ در گردنم افگندہ دوست
می برد ہر جا کہ خاطر خواہِ اوست

دیکھئے ہشت سالہ معصوم کی کیسی صاف اردو ہے لیکن جس قدر یہ معصوم عمر میں ترقی کرتا ہے اردو میں ترقیِ معکوس کرتا ہے اردو بھول جاتا ہے ایسی اردو لکھتا ہے کہ جسے کسی طرح

بھی اردو نہیں کہا جا سکتا۔

شب خمارِ شوقِ ساقی رستخیز اندازہ تھا
تا محیطِ بادہ صورت خانۂ خمیازہ تھا

اگر (تھا)، کی جگہ (بود)، رکھ دیا جائے تو یہ فارسی کا شعر ہو جائے گا۔

اور ایسا ہوتا ہے کہ نصف صدی گذرنے پر اس کو بچپن کی سی قدرت زبان پر حاصل ہوتی ہے۔

شمس العلما نواب امداد امام اثر نے غالب کا بیان لکھا ہے۔[۱]

"میری غزل گوئی کی ابتدا تھی کہ ناسخ مرحوم کا دیوان دہلی میں پہنچا"

ناسخ کا پہلا دیوان ۱۲۳۲ھ میں مرتب ہوا اگر وہ واقعتاً اس سال دہلی پہنچا تو غالب کے ابتدائی زمانے کا تعین کرنے کے لئے ناسخ کے دیوان کی آمد سے زیادہ سے زیادہ اگر دو سال کم کر دیئے جائیں تو مرزا کی شاعری کی ابتدا ۱۲۳۰ھ سے ہوگی اور اس وقت ان کی عمر اٹھارہ سال ہوگی۔ دیوان ناسخ ۱۲۳۲ھ میں مرتب ہوا اگر اس کا دہلی میں آنا اسی سال قرار دیا جائے اور مرزا کی تحریر کے مطابق یہ زمانہ ان کی ابتدائی شاعری کا قرار دیا جائے تو گویا ۱۲۳۱ھ سے ان کی شاعری کا آغاز ہوا۔

مرزا صاحب کے بیان سے یہ بھی ثابت ہے کہ مومن اور وہ دونوں مشق کرتے تھے۔ مومن ۱۲۱۵ھ میں پیدا ہوئے اگر سولہ برس کی عمر سے انھوں نے شاعری شروع کی تو ۱۲۳۱ھ میں مرزا کی عمر انیس سال تھی۔

مرزا غالب نے اپنے خطوں میں اپنی اردو شاعری کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس میں اس قدر اختلاف ہے کہ کسی امرِ قطعی کا تعین نہیں ہو سکتا کیوں کہ بعض سے دس سال، بعض سے گیارہ سال اور بعض سے پندرہ سال نکلتے ہیں۔[۲]

۱؎ کاشف الحقائق جلد دوم ص ۱۲۳ مصنفہ امداد اثر معین الادب لاہور طبع دوم ۱۹۵۶ء

۲؎ علی گڑھ کالج میگزین غالب نمبر ۱۹۵۰ء۔

یعنی ۱۲۲۲ھ / ۱۸۰۷ء، ۱۲۲۴ھ / ۱۸۰۹ء اور ۱۲۲۷ھ / ۱۸۱۲ء ان کا جو خط شمس الامراء کے نام ہے اس میں لکھا ہے کہ تیس سال سے فارسی کہتا ہوں جب سے اردو سے طبیعت ہٹ گئی ہے۔

یہ خط ۱۸۵۳ء کا لکھا ہوا ہے، اس لئے فارسی شاعری کا آغاز ۱۲۳۸ھ مطابق ۱۸۲۲ء قرار دیا جا سکتا ہے۔

مرزا کی شاعری کے متعلق ایک اور روایت ہے جسے بالاتفاق تمام تذکرہ نویسوں نے لکھا وہ یہ کہ مرزا غالب غزل کہہ کر اول میر تقی کے پاس اصلاح کے لئے لے گئے۔ میر صاحب نے غزل دیکھ کر واپس کر دی اور کہا اگر اس لڑکے کو کوئی استاد کامل گیا تو یہ یگانۂ روزگار ہوگا ورنہ مہمل گو ہو جائے گا۔

اس روایت کی تاریخی طور پر جانچ کی جائے تو بالکل لغو ثابت ہوگی۔ غالب ۱۲۱۲ھ میں دہلی چھوڑ کر لکھنؤ چلے گئے تھے۔ گویا مرزا غالب کی ولادت سے پندرہ سال پہلے میر دہلی چھوڑ چکے تھے۔ دہلی میں مرزا کی آمد و رفت کثرت سے شادی کے بعد ہوئی۔ ان کی شادی ۱۸۱۰ء میں ہوئی اور میر لکھنؤ میں ۱۲۲۵ھ مطابق ۱۸۰۵ء میں وفات پا چکے تھے۔ گویا مرزا کی شادی سے پانچ سال پہلے میر صاحب مر چکے تھے اس لئے میر سے مرزا کی ملاقات کسی طرح ممکن نہیں کیوں کہ میرؔ لکھنؤ سے دہلی نہیں آئے اور مرزا غالب ان کی زندگی میں لکھنؤ نہیں گئے۔ مرزا غالب عالمِ جوانی میں مقدمات کی پیروی کے سلسلہ میں حسبِ تحقیق مہر ۱۸۳۷ء میں لکھنؤ گئے تھے۔ گویا میر کی وفات سے تیس برس بعد۔

اس روایت کے لکھنے والوں نے کبھی تحقیق کی تکلیف گوارا نہیں کی۔ اور یہ بھی خیال نہیں کیا کہ اس سے نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ میر نے کہا کہ اگر اس کو کوئی استاد کامل مل گیا تو یگانۂ روزگار رہے گا ورنہ مہمل گو ہو جائے گا۔ مرزا غالب خود لکھتے ہیں کہ وہ کسی کے شاگرد نہیں تو اب نتیجہ کیا سمجھنا چاہئے۔

مرزا صاحب کا یہ فرمانا کہ مجھے مبداءِ فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں قابلِ اعتماد نہیں وہ مولوی معظم اور نظیر کے شاگرد تھے۔ مالک رام لکھتے ہیں[1]۔

---

[1] ذکر غالب ص۱۸

"مرزا[۱] غالب نے ایک غزل فارسی میں یعنی (چہ) کی جگہ (کہ چہ) ردیف لکھی اور اپنے استاد کو دکھائی۔ مولوی محمد معظم نے ردیف کو مہمل کہہ دیا۔"

گیارہ برس کی عمر کے بچے نے یہ غزل کہہ کر مولوی صاحب کو کیوں دکھائی تھی۔ یہ امر یقینی ہے کہ بغرضِ اصلاح پیش کی تھی۔ یہ بھی غلط ہے کہ کیوں کہ مرزا غالب نے شمس الامراء کو ۱۸۵۳ء میں جو خط لکھا ہے اس میں لکھا ہے کہ تیس برس سے فارسی لکھتا ہوں جب سے فارسی لکھنا شروع کیا اردو سے طبیعت ہٹ گئی۔ مثنوی پتنگ نظیر اکبرآبادی کی معلوم ہوتی ہے انھوں نے شاگردِ عزیز کے نام سے اس کے خوش کرنے کو لکھی اس سے ثابت ہے کہ نظیر سے ان کا خاص تعلق تھا۔ دیوانِ غالب کے شارح احسان بن دانش لکھتے ہیں۔[۲]

"بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مرزا میاں نظیر اکبرآبادی کے شاگرد تھے۔"

دلی کے مشہور[۳] شاعر اور مصنف غالب کے ہمعصر سید قطب الدین باطن نے مرزا غالب کو معظم اور نظیر دونوں کا شاگرد لکھا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ اب جبکہ خود استاد ہو گئے تو اس سے انکار کرتے ہیں۔ خوب چند ذکا شاگردِ شاہ نصیر نے لکھا ہے[۴] کہ مرزا غالب مولوی معظم شاعر فارسی و ہندی کے شاگرد تھے۔ غرض یہ ثابت ہے کہ مرزا غالب مولوی معظم اور نظیر دونوں کے شاگرد تھے اور جس طرح انھوں نے اپنا استاد ایک فرضی علامہ ہرمزد پارسی عرف عبدالصمد نام بنایا ہے اسی طرح عبد الواسع قیاس پر بھی اتہام کیا ہے۔ مرزا کا یہ حال ہے کہ مہر لکھتے ہیں۔

"جب[۵] ہوش آیا اور شاعری کی حقیقت سے آگاہ ہوئے تو ان میں سے صرف تھوڑے سے اشعار باقی رہے۔"

اور خود لکھتے ہیں۔

"جب[۶] تمیز آئی تو اس دیوان کو دور کیا اوراق یک قلم چاک کئے۔"

---

۱ ذکرِ غالب ص۱۸ ۲ رموزِ غالب ص۵ مطبوعہ گیلانی الیکٹرک پریس لاہور ۱۹۴۳ء بار دوم ۳ گلستانِ بیخزاں ص۱۲ نول کشور پریس لکھنؤ ۱۸۷۵ء سید قطب الدین ۴ عیار الشعراء ۵ غالب مصنفہ مہر ص۲۸۹ ۶ غالب مصنفہ مہر ص۲۸۹

مہر لکھتے ہیں۔[1]

"جبکہ غالب کی دقت پسند طبیعت بیدل کے مطالعہ سے بہت متاثر تھی لیکن نہ دماغی قوئی نے بلوغ حاصل کیا تھا نہ بیان پر پوری قدرت میسر آئی تھی نہ فکر و تخیل نے جلا پائی تھی وہ بیدل کے خاص الفاظ و ترکیب کو بہ کثرت استعمال کرتے تھے اور اسے بیدل کی پیروی سمجھتے تھے"

احسن مارہروی لکھتے ہیں۔[2]

"مرزا نے جو روش ابتداء میں اختیار کی تھی وہ کسی طرح مقبولِ خاطر اور پسند عام نہیں ہو سکتی تھی۔ مرزا ایک مدت کے بعد اپنی غلط روش سے خبردار ہوئے۔ مدت دراز تک کام کی حقیقت سے آگاہ نہ ہونا اور جس کی پیروی کرنی ہو اس کی روش کو نہ سمجھنا اور برسوں تک غلطی میں مبتلا رہنا اور اس پر خبردار نہ ہونا ذہنِ رسا اور طبع سلیم کی شان سے بعید ہے"

مرزا غالب اور اردو شاعری

مرزا غالب کے حالات اور تذکرہ نویسوں کے بیانات پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب کو بچپن ہی سے اردو شاعری کا شوق تھا۔ مہر صاحب کے بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ انھوں نے آٹھ برس کی عمر میں اردو میں پتنگ کی مثنوی لکھی تہتر برس کی عمر میں انھوں نے وفات پائی تو گویا (۶۵) برس تک اردو میں شاعری کی چونکہ ان کا دیوان نہایت مختصر ہے اور اس میں بھی کسی غزل کا ایک شعر کسی کے دو کہیں مطلع ندارد، کہیں مقطع غائب پھر بعض اشعار مہمل اور اغلاط کثیر ہیں زبان اکثر اشعار کی ایسی ہے کہ نہ جس کو اردو کہا جا سکتا ہے نہ فارسی۔ ان عیوب کی پردہ پوشی کے لئے ان کے مداحوں نے یہ بات بنائی ہے کہ مرزا کو اردو اور اس کی شاعری سے دلچسپی نہ تھی

---

[1] غالب مصنفہ مہر ص۵۹ [2] احسن الانتخاب ص۲ مطبوعہ علی گڑھ پہلا ایڈیشن۔

اور وہ اس کے ثبوت میں مرزا کے چند اشعار پیش کرتے ہیں۔ ایک مرتبہ مرزا نے ذوق کو مخاطب کر کے کہا۔

فارسی بین تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ من است
راست می گویم من و از راست نتواں سر کشید
آں کہ در گفتار فخر تست آں ننگ من است

اور بادشاہ سے عرض کیا

میں کون اور ریختہ ہاں اس سے مدعا
جز انبساط خاطر حضرت نہیں مجھے

جو شخص عقلِ سلیم سے مرزا کے واقعات پر غور کرے گا وہ ان اشعار پر یہی کہے گا کہ مرزا چوں کہ اردو شاعری میں اپنے معاصرین کے مقابلہ میں کامیاب نہ ہو سکے اس لئے یہ بات بنائی انھوں نے (۴۵) برس تک اپنے شوق سے اردو شاعری میں جد وجہد کی۔ بادشاہ کے دربار سے ان کا تعلق ۱۸۵۰ء سے ہوا جب کہ اُن کی شاعری کی عمر (۵۴) سال تھی اور بادشاہ نے بھی ان کو بزمرۂ شعراء ملازم نہیں رکھا تھا بلکہ تاریخ نویس مقرر کیا تھا۔ بادشاہ نے ان سے مشورۂ سخن ذوق کی وفات کے بعد شروع کیا یعنی ۱۸۵۴ء سے ہاں ذوق کی وفات سے کچھ قبل ولی عہد نے ان سے تلمذ اختیار کیا تھا اس لئے وہ زیادہ سے زیادہ پانچ چھ برس دربار ی شاعر کی حیثیت سے رہے۔ لہذا یہ کہنا کہ وہ ولی عہد یا بادشاہ کی فرمائش سے اردو میں کچھ شاعری کر لیتے تھے کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا ۱۸۵۰ء سے قبل ان کا کسی سرکار دربار سے تعلق نہ تھا اور جب وہ بچپن میں آگرہ میں شاعری کرتے تھے کوئی بھی فرمائش کرنے والا یا مجبور کرنے والا نہ تھا وہ جو کچھ کہتے تھے اپنے شوق سے کہتے تھے انھوں نے اردو میں بہت کچھ لکھا۔ خود لکھتے ہیں کہ پچیس برس کی عمر میں ان کا ایک ضخیم دیوان جمع ہو گیا تھا جسے انھوں نے تلف کر دیا پھر دوسرا مجموعہ جمع کیا اس میں سے ان کے احباب

نے انتخاب کیا جو اب موجود ہے سابق مجموعہ کے متعلق مرزا صاحب نے لکھا ہے کہ وہ چاک کر دیا یہ ان کی پچیس برس کی عمر کا واقعہ ہے جب انھیں کوئی جانتا بھی نہ تھا اس لئے اس نسخہ کا وجود یا کسی کے پاس کی نقل کا موجود ہونا اگر بیان کیا جائے تو دور از صداقت ہوگا ہاں دوبارہ جو دیوان جمع ہوا جس میں سے موجودہ دیوان منتخب کیا گیا اس کا یا اس کی نقل کا کسی کے پاس موجود ہونا قرین قیاس ہے۔ اب ان واقعات و حالات پر نظر کرنے کے بعد مرزا کے مداحوں کی کارستانی کو دیکھئے کہ کس طرح باتیں بنائی ہیں جو بروئے واقعات و تاریخ کسی طرح بھی صحیح ثابت نہیں ہو سکتیں آغا طاہر دہلوی لکھتے ہیں۔ [1]

"مرزا اسداللہ خاں غالب اگرچہ فارسی میں ظہوری اور نظیری سے اونچے اڑتے تھے اور ریختہ ان کی آنکھوں میں گرد سے زیادہ وقعت نہ رکھتا تھا مگر اساتذہ کی بلند پروازیاں، احباب کی فرمائشیں زمانے کی رفتار ان کو بھی اس انجمن میں لئے چلی آئی۔ ان کو اس زبان میں شعر کہنا اور پڑھنا عار تھا۔"

احسن مارہروی لکھتے ہیں۔

[2] "مرزا نے اردو شاعری کو اپنا فن قرار نہیں دیا بلکہ محض تفریح طبع کے طور پر کہتے یا اپنے دل کی اپج سے کبھی دوستوں کی فرمائش سے کبھی بادشاہ یا ولی عہد کے حکم کی تعمیل میں ایک آدھ غزل لکھ لیتے تھے۔"

کیا خوب (۶۵) برس تک جد وجہد کرتے رہے دو طومار مرتب کئے۔ سات برس کی عمر سے تہتر برس کی عمر تک اس میں مصروف و مشغول رہے۔ نثر کے مجموعے چھوڑے اگر آنکھوں میں ریختہ گرد تھا اور فن نہیں بنایا تھا تو اتنا بڑا کارنامہ کیسے مرتب ہو گیا۔ وہ چھ برس درباری شاعر رہے قلعہ سے جب ان کا تعلق ہوا تو (۶۳) برس کی عمر تھی (۵۶) برس ان کو شاعری کرتے ہو گئے تھے۔ اور

---

[1] مقدمہ مرأۃ الغالب صـ ۲ [2] احسن الانتخاب صـ ۲

ایک دیوان مرتب کر کے نذرِ آتش کر چکے تھے۔ اُن کے عمل اور ان کے کلام اور تصانیف سے ثابت ہوتا ہے کہ انھوں نے اردو اور اردو شاعری کو اپنا فن بنانے میں پوری جد و جہد کی جس طرح اردو شاعری سے بے تعلقی ظاہر کرنے کے لئے وہ فارسی اشعار پیش کئے جاتے ہیں اس ہی طرح اردو سے دلچسپی رکھنے کے اور اردو شاعری سے شوق و شغف رکھنے کے ثبوت میں ان کے یہ اشعار پیش کئے جا سکتے ہیں۔

ریختہ کے تمھیں استاد نہیں ہو غالب
سنتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

اگر کوئی پوچھے ریختہ کیسے ہو رشکِ فارسی
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

آج مجھ سا نہیں زمانے میں شاعرِ نغز گوی و خوش گفتار

مہر صاحب لکھتے ہیں۔

"دس[1] برس کی مدت میں ایک دیوان جمع کر لیا تھا جب ہوش آیا اور شاعری کی حقیقت سے آگاہ ہوئے تو ان میں سے تھوڑے سے اشعار باقی رکھے باقی قلم انداز کر دیئے قلم انداز کئے ہوئے اشعار کا مجموعہ اعلیٰ حضرت نواب حمید اللہ خاں بہادر فرماں روائے بھوپال کی توجہاتِ عالیہ سے نسخۂ حمیدیہ کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔"

دس برس تک جو دیوان مرتب کیا تھا اس کا تلف کرنا خود مرزا بیان کرتے ہیں وہ اشعار قلم انداز نہیں کئے بلکہ چاک کر کے پھینک دیئے اس وقت وہ نہ روشناس عام تھے نہ اساتذہ و شعراء میں مشہور تھے۔ ایسے وقت میں اس

---

[1] غالب مصنفہ مہر ص۳۹۷

تبرک کا کسی کے پاس پہنچنا اور محفوظ رہنا ممکن ہی نہ تھا۔ نسخہ حمیدیہ میں وہ اشعار ہیں جو دوبارہ دیوان مرتب کیا جس میں سے مولوی فضل حق وغیرہ نے انتخاب کیا۔ اس وقت ان کے شاگرد بھی تھے ان کی شہرت بھی تھی اس نسخے یا اس کی نقل کا موجود ہونا ضرور قرینِ عقل ہے۔ اس قدر کہنا صحیح ہو سکتا ہے کہ چوں کہ وہ فارسی نژاد تھے اس لئے انہیں اردو سے زیادہ فارسی کا شوق تھا۔ باقی یہ کہنا کہ اردو زبان یا اردو شاعری سے ان کو دل چسپی نہ تھی یا انھوں نے اس کو اپنا فن نہیں بنایا یا موجودہ دیوان ان کے پہلے دیوان کا انتخاب ہے کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا۔ آخر عمر میں وہ اردو شاعری سے ضرور دست کش ہو گئے تھے۔ خود لکھتے ہیں۔

"فقیر[لہ] اب ریختہ لکھنے کو جی چاہے نہ مجھ سے کہا جائے۔ اس دو برس (۱۸۵۷ء و ۱۸۵۸ء) میں صرف پچیس شعر بطور قصیدہ تمہاری خاطر لکھ بھیجے تھے"

میری اس کتاب کا تعلق مرزا غالب کی اردو نظم و نثر سے ہے ان کے دیگر حالات اور فارسی تصانیف سے نہیں لیکن چوں کہ آغا طاہر نے لکھا ہے کہ وہ فارسی میں نظیری و ظہوری سے بھی اونچے اڑتے تھے اس لئے ان کی فارسی شاعری کے متعلق ایک رائے لکھ دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ مولوی شبلی نعمانی لکھتے ہیں۔

"اگرچہ[ٹہ] ابتدا میں مرزا غالب بیدل کی پیروی میں گمراہ ہو گیا تھا مگر طالب آملی، نظیری اور کلیم کے اتباع نے اس کو سنبھال لیا۔ غالب نے قصائد میں متوسطین اور قدما کی روش اختیار

لہ غالب مصنفہ عبداللطیف صفہ ۳ بحوالہ اردوئے معلیٰ ٹہ تاریخ نظم خلاصہ شعرالعجم حصہ پنجم مرتبہ سیماب بی اے مطبوعہ تاج بک ڈپو لاہور ۱۹۳۶ء صفہ ۱۱ و ۱۲

کی ابتدائی کلام میں کچھ خامیاں ہیں مگر آخر میں استادانہ رنگ آگیا۔
گویا فارسی شاعری میں ہی وہ اردو کی طرح بھٹکے مگر چوں کہ وہ فارسی الاصل تھے اس لئے اس میں سنبھل گئے۔ نظیری وغیرہ کے اتباع میں استادانہ رنگ آخر میں آگیا مگر ان سے بڑھے نہیں۔

مرزا بیدل

مرزا بیدل فارسی شاعری کے بلند پایہ اور مسلم الثبوت استاد تھے ان کی نازک خیالی ان کی نئی نئی ترکیبیں، ان کے استعارات و تشبیہات مقبول خاص و عام تھے ان کا کلام ایک خاص انداز و اثر رکھتا ہے لیکن یہ تمام باتیں ان کی فارسی شاعری کے لئے مخصوص تھیں۔ اردو میں انھوں نے جو کچھ فرمایا ہے بہت صاف اور سادہ ہے۔

جب دل کے آستاں پر عشق آن کر پکارا
پردے سے یار بولا بیدل کہاں ہے ہم ہیں

چوں کہ قدیم زمانے میں بلکہ ۱۸۵۷ء کے بعد تک فارسی شاعری کو اردو شاعری پر ترجیح حاصل رہی اس لئے اردو کے اکثر شعراء فارسی کے کسی نہ کسی شاعر کی تقلید کرتے تھے۔ چنانچہ میر حسن اپنے تذکرہ میں میر کے متعلق لکھتے ہیں۔

طرزش مانا بطرز شفائی

میر نے بھی اس کا اقرار کیا ہے فرماتے ہیں

ہے غزل میر یہ شفائی کی
ہم نے بھی طبع آزمائی کی

قائم کے متعلق لکھا ہے۔

طرزش بہ طرز طالب آملی می ماند

لیکن فارسی شاعری میں اس زمانے میں مرزا بیدل کے کلام کی دھوم تھی اس لئے اردو کے چند شعراء نے ان کی تقلید کی کوشش کی۔ ایک مرزا

سودا نے مضمون آفرینی میں ان کا اتباع کیا اور بہت کچھ کامیاب رہے۔ دوسرے محمد حسین کلیم نے ان کے متعلق میر نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے۔

اکثر بزبانِ مرزا بے دل حرف می زند

یہ بھی بہت کچھ کامیاب رہے تیسرے شیخ ناسخ، آزاد نے آبِ حیات میں لکھا ہے۔

" صائب کی تشبیہہ و تمثیل کو اپنی صنعت میں ترکیب دے کر ایسی دست کاری اور مینا نگاری فرمائی کہ بعض موقع پر بیدل اور ناصر علی کی حد میں جا پڑے۔"

انھوں نے بھی کامیابی حاصل کی ان کی دیکھا دیکھی مرزا غالب نے بھی یہی انداز اختیار کیا چنانچہ غالب کے خصوصی مداح مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں۔

"[1] جبکہ غالب کی دقت پسند طبیعت بیدل کے مطالعہ سے بہت متاثر تھی لیکن نہ و اغی قوئ نے بلوغ حاصل کیا تھا نہ بیان پر پوری قدرت بلسر آئی تھی نہ فکر و تخیل نے جلا پائی تھی وہ بیدل کے خاص الفاظ و تراکیب کو بہ کثرت استعمال کرتے تھے اور اُسے بیدل کی پیروی سمجھتے تھے۔"

احسن مارہروی لکھتے ہیں۔

"مرزا[2] ایک مدت کے بعد اپنی غلط روش سے خبردار ہوئے۔"

منظفر شاہ خاں ایم اے لکھتے ہیں[3]۔

" غالب اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں رنگ بیدل کے اتباع میں ندرتِ تخیل اور شکوہِ الفاظ کی فکر میں اس طرح کھو گئے تھے کہ ان کے کلام میں وارداتِ محبت اور جذبات نگاری جیسی اہم

---

[1] غالب: مصنفہ مہر ص۴۵۹ [2] احسن الانتخاب ص۳ [3] برہان دہلی جنوری ۱۹۴۸ء

خصوصیات کے پہلو نمایاں نہ ہو سکے، قتلِ عشاق و رقصِ بسمل ایک پامال موضوع ہے غالب نے اپنی ندرتِ تخیل سے بہت حد تک ایک نئے اسلوب میں پیش کیا ہے اور اس میں انھیں کامیابی بھی ہوئی پھر بھی وہ جذبات اور وجدانیات کو متاثر نہ کر سکے۔
غرض یہ کہ غالب بیدل کا اتباع نہ کر سکے۔ لوگ غالب کو تو کہتے نہیں غریب بیدل پر طعن کرتے ہیں۔ پنڈت کیفی دہلوی لکھتے ہیں۔
"مرزا بیدل نے جو بیج بویا تھا وہ مرزا نوشہ کے ذہن میں پھوٹ نکلا جس سے ان کے بعد آنے والوں میں، اقبال سب سے زیادہ مسموم ہوئے"
پنڈت جی بیدل پر خواہ مخواہ برس پڑے بیدل نے اردو میں بس نہیں بویا اردو میں وہ بالکل سادہ رہے یہ قصور تو تقلید کرنے والوں کا ہے کہ اپنی قوت سے زیادہ بوجھ اٹھانے کا ارادہ کیا، اردو کے جن ماہر و مشہور اساتذہ نے بیدل کی پیروی کی وہ بہت کامیاب شاعر ہوئے سودا اور ناسخ ان کے متبع تھے۔ ان کا کلام مشہور خاص و عام ہے اور وہ اردو کے مسلم الثبوت اساتذہ میں شمار ہوتے ہیں۔
ولی اللہ محب (۱۲۰۷ھ ہم عصر انشا) بیدل کے طرز پر چلتے تھے۔
ان کا کلام دیکھئے کیا بات ہے فرماتے ہیں۔

مدفن سے عاشقوں کے وہ گلگوں سوار حیف
قدرے عناں کشیدہ نہ گزرا ہزار حیف

اس گلِ عارض کو جوں خورشید تاباں دیکھ کر
شبنم بے تاب ہو کر اڑ چلا ہے رنگ گل

دل تو پہلے لے چکے اب کیا ہے مطلب آپ کا
بے تکلف وہ بھی کہہ دیجے کہ جو ہے آپ کا

صحرا میں خار، باغ میں گل، گل میں بو ہوا
جس رنگ میں نمود ہوا یار تو ہوا

اس بزم میں کسی کو ملا غم کسی کو عشق
ساغر کو خندہ، گریہ نصیبِ سبو ہوا

تو اور تیری چاہ پوچھنا کیا
صدمے ترے وہ پوچھنا کیا

وہ سجیں کہاں وہ دھجیں کہاں وہ اکڑ کج وہ پھبن غلط
ترے قد سے دعویٰ ہمسری جو رکھے ہے سرو چمن غلط

محمد حسین کلیم دہلوی ہم عصر میر کے متعلق اہلِ نظر کا اتفاق ہے کہ بیدل کے متبع تھے
کیسا صاف ستھرا کلام ہے واہ واہ۔

درازی شبِ ہجرانِ زلفِ یار کلیم
مجھی سے پوچھ کہ کاٹی ہے رات آنکھوں میں

نیرنگیٔ جمال سے حیرت فشانہ ہوں
طاؤس جلوہ زار ہوں آئینہ خانہ ہوں

قافلے کتنے گئے کوئی نہ سمجھا کیا ہے   شور کرتی رہی بانگِ درا کیا کیا کچھ

بات اس کی زبان پر آئی
پھر خرابی جہان پر آئی

ہو گیا حشر گئی دوزخ و جنت کو خلق
رہ گیا میں ترے کوچے میں گرفتار ہنوز

غرورِ حسن ممکن کیا کسی کی داد کو پہونچے
غرض تم سن چکے احوال ہم فریاد کو پہونچے

مرزا غالب زبان پر قادر نہ تھے نہ ایسے ذہین و طباع تھے جیسے کلیم و محبوب وغیرہ
نہ اس قدر ذی علم ثابت ہوئے اس لئے ان سے بیدل کی پیروی نہ ہو سکی۔ لوگ
مرزا کے ساتھ بیدل پر بھی برس پڑتے ہیں، یہ کیا انصاف ہے۔

مرزا غالب کا اردو میں شعر کہنے کا طریقہ

مہر لکھتے ہیں۔[1]

"ابتدائی اردو کلام میں فارسیت کی افراط محتاجِ اعادہ نہیں۔ بادی النظر میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ پہلے فارسی شعر کہہ لیتے تھے۔ اس کے بعد کہیں کہیں اس میں فارسی الفاظ کی جگہ اردو الفاظ داخل کر دیتے تھے۔"

پروفیسر کلیم الدین بی اے کینٹب لکھتے ہیں۔[2]

"الفاظ اور بندشوں سے فارسیت صاف نمایاں ہے صرف کہیں چند الفاظ اردو کے جوڑ دیتے ہیں اور اکثر نہایت بے موقعہ طریقہ پر۔"

ابو العلا ناطق اکبر آبادی لکھتے ہیں۔[3]

"مرزا صاحب کے اشعار میں دو امر پائے جاتے ہیں یا تو مضمون متقدمین شعراء کا لے کر تھوڑے تغیر سے اپنے الفاظ میں بیان کرتے ہیں جس کو اصطلاح میں سرقہ خفی کہتے ہیں۔ یا مصطلحات الشعراء سے بعض الفاظ لے کر کسی مضمون کو ادا کرنا چاہتے ہیں لیکن چوں کہ اصطلاحی الفاظ کو وہ اچھی طرح ترتیب نہیں دے سکتے اس لئے ان کا شعر مہمل ہو جاتا ہے۔"

---

[1] غالب مصنفہ مہر صفحہ ۴۵۶ [2] اردو شاعری پر ایک نظر صفحہ ۹۶ مصنفہ کلیم الدین احمد مطبوعہ قومی پریس بانکی پور پہلا ایڈیشن [3] رسالہ شباب اردو لاہور جون سنہ ۱۹۲۱ء۔

باب دوم

غالب کی شاعری کا تاریک پہلو

زبانِ غالب

مرزا غالب کے دیوان میں دو قسم کی زبان ہے ایک وہ زبان جس کو نہ فارسی کہا جاسکتا ہے نہ اردو، دوسری وہ زبان جس کو اردو کہہ سکتے ہیں یہ اخیر زمانہ کی زبان ہے اس لئے ان کی نظم کی زبان کو اس طرح موسوم کیا جاسکتا ہے۔
ابتدائی زمانے کی زبان - اخیر زمانے کی زبان۔

"ابتدائی زمانے کی زبان"

شمارِ سبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا
تماشائے بہ یک کف بردنِ صد دل پسند آیا

دونوں مصرعوں میں (آیا) کی جگہ (آمد) ہوجائے تو فارسی کا شعر ہوجائے۔
ان کے دیوان میں ایک ثلث اشعار کی یہی زبان ہے۔

نشہ ہا شادابِ رنگ و ساز ہا مستِ طرب
شیشۂ مے سروِ سبزِ جوئبارِ نغمہ ہے

تا کجا اے آگہی رنگِ تماشا باختن
چشمِ وا گردیدہ آغوشِ وداعِ جلوہ ہے

یہ زبان نہ آبرو کی ہے، نہ ناجی کی، نہ میر کی، نہ سودا کی، نہ مصحفی کی، نہ انشا کی، یہ زبان اگر مشابہ ہے تو جعفر زٹل کی زبان سے مشابہ ہے جو کہتا ہے۔

نخستیں کلاں تر کہ بر کھٹ[۱] کرد
ہمہ کار و بارِ پدر بر بھنٹ[۱] کرد

البتہ دونوں میں فرق یہ ہے کہ جعفر غیر مہذب الفاظ لاتا ہے یہ مہذب الفاظ لاتے ہیں۔ وہ مسخرگی سے ایسا کرتا ہے یہ مجبوری سے کیوں کہ زبان پر پوری قدرت نہیں۔ اس زبان کے متعلق رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں۔

[۱] "اچھا ہوا کہ اس قسم کی زبان جس پر فارسیت کا اس قدر رنگ غالب تھا رواج پذیر نہیں ہوئی ورنہ پھر اردو اور فارسی میں فرق ہی کیا رہ جاتا اس ہی فارسیت کے غلبہ کی وجہ سے مومن اور غالب کا اکثر کلام سمجھ میں نہیں آتا۔"

احسن مارہروی لکھتے ہیں۔

[۲] "جیسے خیالات اجنبی تھے ویسے زبان غیر مانوس تھی۔"

مولوی حکیم عبدالحی لکھتے ہیں۔

[۳] "ان کے دیوان میں ایک ثلث کے قریب ایسے اشعار موجود ہیں جن پر اردو زبان کا اطلاق بشکل ہو سکتا ہے۔"

شمس العلما[۴] نواب امداد امام اثر لکھتے ہیں۔

الفاظ فارسی کی وہ کثرت دیکھی جاتی ہے کہ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اردو کے اشعار زیر نظر ہیں یا فارسی کے۔

مولوی عبدالسلام ندوی لکھتے ہیں۔

---

[۱] تاریخ ادب ترجمہ ہسٹری آف اردو لٹریچر نول کشور پریس ۱۹۲۹ء ص ۲۹
[۲] احسن الانتخاب ص یونیورسٹی پریس علی گڑھ (سن تحریر نہیں)، [۳] گل رعنا ص ۱۱۳ طبع ثانی ۱۳۵۳ھ مطبوعہ معارف اعظم گڑھ [۴] کاشف الحقائق ص ۱۴۴ جلد دوم کاروبنس پریس لکھنؤ۔

"ان[1] کے کلام میں استعارات و کنایات کی نہایت کثرت پائی جاتی ہے اضافتوں کی بھرمار ہے فارسی الفاظ اس کثرت سے موجود ہیں کہ بعض اشعار اردو زبان کے معلوم ہی نہیں ہوتے بمضامین میں بھی بہ کثرت اشکال و اغلاق ہے۔"

شمس العلماء پروفیسر مولانا عبدالرحمٰن دہلوی لکھتے ہیں۔[2]

"نقشِ نازِ بتِ طناز بہ آغوشِ رقیب
پائے طاؤس پئے خامۂ مانی مانگے
شمارِ سبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا
تماشائے بہ یک کف بردنِ صد دل پسند آیا"

"لفظ لفظ مانوس و فصیح ترکیب میں وہ انسجام و روانی کہ معلوم ہوتا ہے بھرن پڑ رہی ہے یا موتی ہیں کہ طشتِ طلائی میں پڑے ڈھلک رہے ہیں اور معانی وہ کہ نقشِ ناز بھی شرما جائے طاؤسِ رقصاں کی کیا حقیقت ہے لیکن اس اردو زبان کو دیکھیے کیسے بھاگ لگے ہیں کہتی ہے اور بے لاگ لپیٹ صاف کہتی ہے کہ یہ شعر پھولوں کے گجرے ہیں یا موتیوں کے ہار مجھے نہیں بھاتے یہ میری پسند میرے مذاق کے نہیں بنے آیا اور مانگا کے سوا ان میں میرا کیا رکھا ہے باقی پھول ہیں تو بدیسی جن کی بو باس سے میرا سر چکراتا ہے اور موتی ہیں تو موتی میرے سر نہ چپکاؤ فارسی کے پاس لے جاؤ شیراز و اصفہان پہنچاؤ وہاں بھی کوئی خریدار نہ پاؤ تو زبانِ غالب کی نام کی ایک نئی دنیا بناؤ اور اس میں جا سجاؤ غالب میرا سر تاج ہے اس کی

---

[1] شعر الہند حصہ اول صہ ۱۷۶ [2] مرأۃ الشعراء صہ ۵۴ جید برقی پریس دہلی سنہ ۱۹۲۶ء۔

نظم ونثر کا میری قلمرو میں رواج ہے میں اس کی عزت کرتی ہوں اونچی
اونچی کرسیوں میں جگہ دیتی ہوں مگر نہ فارسی اور اس انوکھی شاعری
کے زور پر بلکہ اس طرز وطور پر جو میرا ہے جب غالب اس کا ہے تو
میرا ہے اس سے زیادہ اس کا میرا واسطہ نہیں میں نے اس کے
ایسے کتنے ہی طبع زاد اس کے قلم سے کٹوا کر اپنی قلمرو سے نکال
دیئے۔ یہ اکا دکا جو رہ گئے ہیں یہ اُس کی اور اس کے یاروں کی
سینہ زوری ہے میں اس کی عزت و تعظیم کرتی تھی اور کرتی ہوں
لیکن ان ناشدنیوں کی خاطر میں نے ان کو آج تک منہ نہیں لگایا ہے
نہ لگاؤں گی جو آج ان کے طرفدار ہیں کل دیکھنا وہ بھی ان سے منہ
موڑ لیں گے کھوٹا کھرا الگ ہو جائے گا اور اپنا پرایا معلوم
ہو جائے گا۔

حکیم ابو عزیز غلام غوث لکھتے ہیں۔

"غالب[1] نے لکھا ہے مگر اب بھی ان کے دیوان میں ایک ثلث کے قریب
بہت سے اشعار ایسے پائے جاتے ہیں جن پر اردو زبان کا اطلاق
مشکل سے ہو سکتا ہے"

آغا محمد باقر دہلوی لکھتے ہیں۔

"زبان[2] کے حق میں یہ بہت اچھا ہوا کہ اس طرز نے رواج نہیں پایا"

"آخیر زمانے کی زبان"

ان کی زبان پر جب چاروں طرف سے اعتراضات وطنز وطعن کی بوچھار

---

[1] رسالہ شباب اردو لاہور مئی ۱۹۲۱ء [2] تاریخ نظم ونثر اردو
ص ۲۱ عالمگیر پریس لاہور ۱۹۴۲ء۔

ہوئی تو انھوں نے میر اور ذوق کی تقلید شروع کی درحقیقت دہلی میں رہتے رہتے مشاعروں میں شریک ہوتے ہوتے اساتذہ کے کلام سنتے سنتے اور خود بھی شعر کہتے کہتے اب وہ زبان پر اس قدر قابو پا چکے تھے کہ اس میں اظہار مافی الضمیر کر سکیں تو آخر عمر میں انھوں نے صاف شعر کہنے شروع کئے مگر اس میں بعض الفاظ ومحاورات غلط استعمال کر گئے مثلاً

آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

(زلف کا سر ہونا) محاورہ نہیں ہے۔ پروفیسر حامد حسن قادری نے بھی اپنی کتاب نقد ونظر[1] میں اس شعر پر یہ اعتراض پیش کیا ہے اس کے علاوہ تعقید معنوی بھی ہے اور گنجلک بھی ہے۔

کفر سوز اس کا وہ جلوہ ہے کہ جس سے ٹوٹے
رنگِ عاشق کی طرح رونقِ بت خانۂ چین

(رنگ ٹوٹنا) محاورہ نہیں (رنگ اڑنا) محاورہ ہے۔ طباطبائی[2] اور پروفیسر حامد حسن نے بھی یہ اعتراض کیا ہے اور پہلے مصرعہ کے گنجلک ہونے کی بھی شکایت کی ہے اس لئے یہ شعر مہملات میں شمار ہونے کی قابل ہے۔ اس شعر پر اغلاط کے بیان میں بھی بحث آئے گی۔

حاصل سے ہاتھ دھو بیٹھ اے آرزو خرامی
دل جوشِ گریہ میں ہے ڈوبی ہوئی اسامی

(اسامی) غلط ہے صحیح (آسامی) ہے آغا باقر نے بھی شرح دیوانِ غالب میں (آسامی) لکھا ہے اس پر بحث اغلاط میں ہوگی۔

---

[1] نقد ونظر ص۱۳ آگرہ اخبار برقی پریس سنہ ۱۹۴۲ء [2] شرح دیوانِ غالب طباطبائی مطبوعہ النواریک ڈپو لکھنؤ سنہ ۱۹۵۴ء بار اول

صاف زبان میں ان کا کلام بہت تھوڑا ہے تقریباً چار سو شعر ہوں گے اور ان میں سے اغلاط آمیز اور مہملات کو خارج کیا جائے تو اور بھی کم ہو جائیں گے۔
نیاز فتحپوری لکھتے ہیں۔

"غالب[1] کا اردو کلام بہت تھوڑا ہے اور اس میں بھی صحیح رنگ تغزل چوتھائی حصہ سے زیادہ نہیں۔ غالب کے اردو کلام کا ایک حصہ تو وہ ہے جسے فارسی کلیات میں شامل ہونا چاہیئے تھا بہتر ان کا رنگ وہ ہے جس میں انھوں نے سادگی اور سلاست سے کام لیا ہے لیکن یہ رنگ ان کے یہاں بہت کم ہے اور اس میں بھی سوز و گداز خال خال کہیں نظر آتا ہے۔"

آغا طاہر دہلوی لکھتے ہیں۔

"اگر[2] مرزا کے کلام کو تقسیم کیا جائے اور غدر سے کچھ دنوں پہلے کا کلام الگ کر لیا جائے تو اس وقت معلوم ہو سکتا ہے کہ مرزا اردو میں شعر کہتے ہیں یا فارسی میں ـــ اس وقت (مومن و ذوق کے بعد) زبان میں تغیر پیدا ہوا میر اور ذوق کی زبان اشعار میں آنے لگی۔"

پروفیسر کلیم الدین لکھتے ہیں۔

"وہ[3] کم از کم تین طرز سے اظہار خیالات کرتے ہیں۔ پہلے رنگ میں فارسیت کا غلبہ ہے الفاظ اور بندشوں سے فارسیت صاف نمایاں ہے صرف کہیں کہیں چند الفاظ اردو کے جوڑ دیتے ہیں۔ اور اکثر نہایت بے موقعہ طریقہ پر ـــ دوسری جانب انتہائی

---

[1] نگار لکھنؤ جون ۱۹۳۶ء [2] مقدمہ مرأۃ الغالب ص۲ مصنفہ بیخود دہلوی محبوب المطابع دہلی ۱۹۲۴ء بار اول [3] اردو شاعری پر ایک نظر ص۲۶ مصنفہ پروفیسر کلیم الدین احمد بی اے کینٹب مطبوعہ قومی پریس بانکی پور۔

سادگی ہے۔ غالب کا تیسرا رنگ ان دو رنگوں کے وسط میں واقع ہوا ہے۔ مرزا غالب کے شاگرد بھی ان کی زبان کی تعریف نہیں کرتے حالی کی رائے پہلے لکھی جا چکی ہے۔ مجروح کہتے ہیں۔

شعر میں بے مثال ہے مجروح
معنی غالب و سلاست میر

۱۸۵۴ء سے یعنی ذوق کی وفات پر جب بادشاہ نے ان سے مشورۂ سخن اختیار کیا تو انھوں نے صاف زبان لکھنا شروع کی اس وقت ان کو زبان پر بہ نسبت سابق کے کچھ اچھی قدرت حاصل ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر زور لکھتے ہیں۔

"[۵۱] غالب پہلے اردو میں اپنے خیالات ظاہر کرتے وقت زبان پر کافی قابو نہیں رکھ سکتے تھے۔"

مہر نے بھی لکھا ہے کہ بہت دنوں تک وہ بیان پر قدرت نہ پا سکے یہ حوالہ کہیں نقل کیا جا چکا ہے۔ ڈاکٹر بجنوری مرحوم لکھتے ہیں۔

[۵۲] غالب کی شاعری کے جسم پر زبان کا جامہ اسی وجہ سے تنگ ہے "یہاں تک کہ بعض جگہ چاک ہو گیا اور عریاں ساق اندر سے نظر آتا ہے۔"

زبان پر قابو اور قدرت نہ ہونے کی وجہ سے وہ اپنے اردو خطوط میں بھی بعض جگہ محاورات و قواعد کی خلاف ورزی کر گئے ہیں۔

پنڈت کیفی دہلوی نے بھی لکھا ہے۔[۵۳]

"مرزا نوشہ کے سر سے وہ افراسیابی بحران اتر گیا تھا۔"

---

۵۱ روح تنقید حصہ دوم ص۸۰ مطبوعہ مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن ۱۹۳۰ء
۵۲ رسالہ اردو اورنگ آباد جنوری ۱۹۲۱ء مضمون محاسن کلام غالب پہلا ایڈیشن ۵۳ کیفیہ ص۲۹

غالب کا رنگ

مرزا بیدل فارسی شاعری کے مسلم الثبوت اساتذہ اور شعراء میں سے تھے وہ فارسی نظم میں نئی نئی ترکیبیں، تمثیلیں، اور تشبیہیں اختراع کیا کرتے تھے جو مقبول اور پسندیدہ ہوتی تھیں۔ چوں کہ ذی علم، مشاق، طباع و ذہین اور سنجیدہ و فہمیدہ آدمی تھے اس لئے اردو میں جب کبھی اظہار خیال کیا تو اپنے فارسی طرز پر نہیں چلے بلکہ نہایت سادہ روش اختیار کی فرماتے ہیں۔

مت پوچھ دل کی باتیں وہ دل کہاں ہے ہم ہیں
اس تخمِ بے نشاں کا حاصل کہاں ہے ہم ہیں
جب دل کے آستاں پر عشق آن کر پکارا
پردے سے یار بولا بیدل کہاں ہے ہم ہیں

مرزا غالب نے جب اردو شاعری شروع کی تو بیدل کا فارسی والا انداز اختیار کیا۔ دیگر اسباب کے علاوہ اس طرز کے اختیار کرنے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ ان کو اردو زبان پر قدرت حاصل نہ تھی اس لئے یہ کمزوری اس پردہ میں کسی قدر نبھ سکتی تھی۔ اس روش کے اختیار کرنے کا یہ نتیجہ نکلا کہ زبان نہ فارسی رہی نہ اردو، اور بعض اشعار ایسے ہو گئے جن کو لوگ مہمل کہنے لگے۔ غالب خود کہتے ہیں۔

اسد ہر جا سخن نے طرحِ باغِ تازہ ڈالی ہے
مجھے رنگِ بہارِ ایجادیِ بیدل پسند آیا

طرزِ بیدل میں ریختہ لکھنا — اسد اللہ خاں قیامت ہے

جب کثرت سے طعن و طنز و اعتراضات ہوئے تو اس طرز کو چھوڑ کر ناسخ کی روش اختیار کی۔ ناسخ کے یہاں خیالات و تشبیہات نازک و بلند ہیں۔ وہ فارسی الفاظ زیادہ لاتے تھے اس لئے مرزا غالب کا کلام اس

سادگی ہے۔ غالب کا تیسرا رنگ ان دو رنگوں کے وسط میں واقع ہوا ہے۔
مرزا غالب کے شاگرد بھی ان کی زبان کی تعریف نہیں کرتے حالی کی رائے پہلے لکھی جا چکی ہے۔ مجروح کہتے ہیں۔

شعر میں بے مثال ہے مجروح
معنی غالب و سلاست میر

۱۸۵۴ء سے یعنی ذوق کی وفات پر جب بادشاہ نے ان سے مشورۂ سخن اختیار کیا تو انھوں نے صاف زبان لکھنا شروع کی اس وقت ان کو زبان پر بہ نسبت سابق کے کچھ اچھی قدرت حاصل ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر زور لکھتے ہیں۔

"غالب[۵۱] پہلے اردو میں اپنے خیالات ظاہر کرتے وقت زبان پر کافی قابو نہیں رکھ سکتے تھے۔"

مہر نے بھی لکھا ہے کہ بہت دنوں تک وہ بیان پر قدرت نہ پا سکے یہ حوالہ کہیں نقل کیا جا چکا ہے۔ ڈاکٹر بجنوری مرحوم لکھتے ہیں۔

غالب[۵۲] کی شاعری کے جسم پر زبان کا جامہ اسی وجہ سے تنگ ہے
"یہاں تک کہ بعض جگہ چاک ہو گیا اور عریاں ساق اندر سے نظر آتا ہے۔"

زبان پر قابو اور قدرت نہ ہونے کی وجہ سے وہ اپنے اردو خطوط میں بھی بعض جگہ محاورات و قواعد کی خلاف ورزی کر گئے ہیں۔
پنڈت کیفی دہلوی نے بھی لکھا ہے۔
"مرزا[۵۳] نوشہ کے سر سے وہ افراسیابی بحران اتر گیا تھا۔"

---

۵۱ روح تنقید حصہ دوم ص۸۵ مطبوعہ مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن ۱۹۳۰ء
۵۲ رسالہ اردو اورنگ آباد جنوری ۱۹۲۱ء مضمون محاسن کلام غالب پہلا ایڈیشن ۵۳ کیفیہ ص۲۹

غالب کا رنگ

مرزا بیدل فارسی شاعری کے مسلم الثبوت اساتذہ اور شعراء میں سے تھے وہ فارسی نظم میں نئی نئی ترکیبیں، تمثیلیں، اور تشبیہیں اختراع کیا کرتے تھے جو مقبول اور پسندیدہ ہوتی تھیں۔ چوں کہ ذی علم، مشاق، طباع و ذہین اور سنجیدہ و فہمیدہ آدمی تھے اس لئے اردو میں جب کبھی اظہار خیال کیا تو اپنے فارسی طرز پر نہیں چلے بلکہ نہایت سادہ روش اختیار کی فرماتے ہیں۔

مت پوچھ دل کی باتیں وہ دل کہاں ہے ہم ہیں
اس تخمِ بے نشاں کا حاصل کہاں ہے ہم ہیں
جب دل کے آستاں پر عشق آن کر پکارا
پردے سے یار بولا بیدل کہاں ہے ہم ہیں

مرزا غالب نے جب اردو شاعری شروع کی تو بیدل کا فارسی والا انداز اختیار کیا۔ دیگر اسباب کے علاوہ اس طرز کے اختیار کرنے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ ان کو اردو زبان پر قدرت حاصل نہ تھی اس لئے یہ کمزوری اس پردہ میں کسی قدر نبھ سکتی تھی۔ اس روش کے اختیار کرنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ زبان نہ فارسی رہی نہ اردو، اور بعض اشعار ایسے ہو گئے جن کو لوگ مہمل کہنے لگے۔ غالب خود کہتے ہیں۔

اسد ہر جا سخن نے طرحِ باغِ تازہ ڈالی ہے
مجھے رنگِ بہار ایجادیِ بیدل پسند آیا

طرزِ بیدل میں ریختہ لکھنا　　اسد اللہ خاں قیامت ہے

جب کثرت سے طعن و طنز و اعتراضات ہوئے تو اس طرز کو چھوڑ کر ناسخ کی روش اختیار کی۔ ناسخ کے یہاں خیالات و تشبیہات نازک و بلند ہیں۔ وہ فارسی الفاظ زیادہ لاتے تھے اس لئے مرزا غالب کا کلام اس

طرز کو اختیار کرنے میں بھی قریب قریب ویسا ہی رہا جیسا کہ پہلے تھا۔ اور چوں کہ اردو پر قادر نہ تھے اس لئے اس طرز کو نبھا بھی نہ سکے آخر اس کو بھی ترک کیا اور مومن کا انداز لیا مومن کا یہ طرز تھا کہ وہ اکثر موقعوں پر مضمون کے بعض ایسے اجزا چھوڑ جاتے تھے کہ جن کی طرف سامع کا ذہن خود بخود منتقل ہو جاتا تھا، خاص لطف حاصل ہوتا تھا اور شعر میں بعض جگہ دو معنی پیدا ہو جاتے تھے۔ یہ شاعری کا بہت ہی نازک پہلو ہے۔ اس میں ذرا سی بے اعتدالی ہونے سے شعر پیچیدہ کیا مہمل کے قریب ہو جاتا ہے۔ مرزا اس طرز پر چلے لیکن کماحقہ، کامیاب نہ ہو سکے۔ مومن کی طرح مضمون کو صاف زبان میں ادا نہ کر سکے قواعد صرف و نحو کی ایسی غلطیاں ترک الفاظ میں کر گئے کہ شعر مہمل ہو گیا پھر اس روش کو چھوڑ کر ذوق اور میر کا انداز لیا اس طرز میں آئے تو نازک خیالی نہ رہی، سوز و گداز کم ہو گیا بعض محاورات و الفاظ میں غلطی کر گئے۔

مولوی حکیم عبدالحیؒ لکھتے ہیں۔

"جو روش[۵۱] مرزا بیدل نے فارسی زبان میں اختراع کی تھی مرزا نے اردو میں اسی پر چلنا شروع کیا"

مہر لکھتے ہیں۔

"جب[۵۲] کہ غالب کی وقت پسند طبیعت بیدل کے مطالعہ سے بہت متاثر تھی لیکن نہ دماغی قویٰ نے بلوغ حاصل کیا تھا نہ بیان پر پوری قدرت بلسر آئی تھی نہ فکر و تخیل نے جلا پائی تھی۔ وہ بیدل کے خاص الفاظ و تراکیب کو بہ کثرت استعمال کرتے تھے اور اسے بیدل کی پیروی سمجھتے تھے"

---

۵۱ گلِ رعنا صہ ۳۱۱ ۵۲ غالب مصنفہ مہر صہ ۲۵۹

مولوی عبدالسلام ندوی لکھتے ہیں۔

"غالبؔ[1] کے کلام نے تناسخ کے بہت سے دور کے بعد موجودہ قالب اختیار کیا پہلے وہ بیدل کے رنگ میں کہتے تھے۔"

احسن مارہروی لکھتے ہیں۔

"جو روش[2] مرزا بیدل نے فارسی زبان میں اختراع کی تھی اسی روش پر غالب نے اردو میں چلنا اختیار کیا۔"

شمس العلماء[3] نواب امداد اثر لکھتے ہیں۔

"اپنی غزل سرائی کی نسبت حضرت فرماتے تھے کہ میری غزل گوئی کی ابتدا تھی کہ ناسخ مرحوم کا دیوان دہلی میں پہلی پہل پہنچا شیخ کی سخن سنجی کی تمام شہر میں دھوم مچ گئی میں نے اور مومن نے ان کا تتبع کرنا چاہا ہم لوگوں نے شیخ مرحوم کے رنگ میں مشق کلام کرنا شروع کیا مگر شیخ کا رنگ ہم لوگوں میں نہ آیا مومن مشق کے بعد ویسے ہی ہو گئے جیسا ان کا رنگ دیکھا جاتا ہے اور ہم میر کے رنگ میں در آئے۔"

مولوی عبدالسلام ندوی لکھتے ہیں۔

"لیکن ان[4] دونوں بزرگوں (غالب و مومن) سے یہ روش (ناسخ کی) نبھ نہ سکی اس لئے دونوں نے الگ الگ رنگ اختیار کیا۔"

پروفیسر فراق گورکھپوری لکھتے ہیں۔

"جب[5] پہلی پہل دیوانِ ناسخ کی کچھ جلدیں دہلی پہنچیں تو غالبؔ ذوق

۱؎ شعر الہند حصہ اول ص۲۴۹ مطبوعہ اعظم گڑھ پہلا ایڈیشن سنہ ۱۹۴۲ء
۲؎ احسن الانتخاب ص۶ ۳؎ کاشف الحقائق جلد دوم ص۱۲۳ ۴؎ شعر الہند حصہ اول ص۲۴۹ ۵؎ نگار جون سنہ ۱۹۳۸ء

مومن اور دوسرے استادوں نے کہا کہ اب تک جو اندازِ بیان رائج تھا اُس کی آخری گھڑی آگئی ہم سب کو اس ہی رنگ میں کہنا چاہیئے۔

احسن مارہروی لکھتے ہیں۔

"مرزا[۵۱] نے جو روش ابتدا میں اختیار کی تھی وہ کسی طرح مقبولِ خاطر اور پسند عام نہیں ہو سکتی تھی ــــ مرزا ایک مدت کے بعد اپنی غلط روش سے خبردار ہوئے"

نیاز فتحپوری لکھتے ہیں۔

"غالب[۵۲] صرف مومن ہی سے متاثر نہیں ہوا تھا بلکہ نصیر اور ناسخ سے بھی"

جب اردو میں شعر کہتے نصف صدی گزر گئی تو زبان میں مہارت ہوئی ادھر ذوق اور مومن وغیرہ گزر گئے اور بادشاہ کی غزلیں ان کے پاس آنے لگیں یہ جانتے تھے کہ بادشاہ سادگی پسند ہے اور عام طور پر بھی سادہ روش کو پسند کیا جاتا ہے اس لیئے انھوں نے اب اپنا انداز بدلا اور سادگی پر آگئے اس رنگ میں آکر نازک خیالی اور سوز و گداز اور بڑھا۔ اس طرز کا ان کا کلام بہت تھوڑا ہے اس ہی کو اردو کلام اور صحیح کلام کہا جا سکتا ہے۔ مولوی عبدالسلام ندوی لکھتے ہیں۔

"در[۵۳] حقیقت بیدل اور ناسخ کے گورکھ دھندے سے نکلنے کے بعد انھوں نے تیسری دور کے متاخرین شعرا سے فارسی کی روش اختیار کی ــــ اب میر کے طرز میں کہنا شروع کیا۔

---

۵۱ احسن الانتخاب صفہ ۵۲ نگار اپریل ۱۹۴۳ء ۵۳ شعر الہند حصہ اول صفہ ۲۵۰

ناسخ کے گورکھ دھندے سے وہ مرتے مرتے بھی نہیں نکلے۔ ناسخ کا مکمل طرز تو اُن سے نبھ نہ سکا جس کا انھوں نے خود اقرار کیا ہے۔ ناسخ کے طرز کے ایک جزو اور ناسخ کی ایک اصلاح پر وہ اخیر تک کاربند رہے۔ ناسخ نے یہ طرز چلایا تھا کہ جتنے کم الفاظ میں مطلب ادا ہو سکے اتنی ہی فصاحت و بلاغت کے اصول کی پابندی ہوگی۔ اس کو تفصیل کے ساتھ صاحب شعرالہند نے حصہ اول ص۲۰۲ پر بیان کیا ہے۔ مرزا غالب اور مومن نے اس ہی کو اختیار کیا۔ مومن اس انداز کو مرزا سے بہتر طریقہ پر نباہ گئے۔ مرزا کمی الفاظ کے خیال میں لغت و قواعد کی بہت سی غلطیاں کر گئے۔ پروفیسر آزاد لکھتے ہیں۔

"اواخر عمر[۱] میں نازک خیالی کے طریقہ کو بالکل ترک کر دیا تھا چنانچہ دیکھو اخیر کی غزلیں صاف ہیں۔"

پروفیسر کلیم الدین لکھتے ہیں۔

"میر[۲] و درد کی طرح ان کا کوئی خاص انداز نہیں۔"

نیاز فتحپوری لکھتے ہیں۔

"غالب نے[۳] بیدل کو سامنے رکھ کر فارسی ترکیبیں استعمال کیں۔ یہ بھی یقینی ہے کہ یہ تحریک پیدا ہوئی مومن کے کلام کو دیکھ کر۔ پھر چوں کہ غالب اپنی فطرت کی بنا پر یہ نہ چاہتے تھے کہ لوگ مومن کا تتبع سمجھیں اس لئے انھوں نے اس میں بہت زیادہ گہرا رنگ پیدا کرنا چاہا اور اس طرح کلام مومن سے امتیاز پیدا کرنے کی کوشش میں اول اول ان کے قلم سے اس قسم کے اشعار نکلے جو باوجود ثقیل تراکیب کے کوئی ندرتِ مفہوم نہ رکھتے تھے۔

---

[۱] آبِ حیات، ذکرِ غالب [۲] اردو شاعری پر ایک نظر ص۶۶ [۳]

حصہ اول ص۳۰ مطبوعہ عہد آفریں پریس حیدرآباد دکن ۱۹۴۳ء

جراحت تحفہ، الماس ارمغاں، داغِ جگر ہدیہ
مبارکباد اسدؔ غمخوارِ جانِ دردمند آیا
شب خمارِ شوقِ ساقی رستخیز اندازہ تھا
تا محیطِ بادہ صورت خانۂ خمیازہ تھا

لیکن جب انھوں نے محسوس کیا کہ یہ اندازِ شاعری نہ محمود ہے نہ مقبول ہے تو مجبوراً انھیں پھر مومن کی سطح پر آنا پڑا۔
شیخ محمد اکرم آئی سی ایس لکھتے ہیں۔

"مومنؔ اور غالبؔ ناسخ کے پیرو تھے"[۱]

الغرض بقول پروفیسر کلیم الدین کے ان کا کوئی خاص رنگ نہ تھا۔ یہ اس میدان میں عمر بھر بھٹکتے ہی رہے۔

بیانِ غالب اور مہملات

مرزا غالب کے کلام کا اکثر حصہ ایسا ہے جس کا سمجھنا دشوار ہے۔ کچھ اندازِ بیان کی پیچیدگی کی وجہ سے کچھ زبان میں فارسیت کے غلبہ کے سبب سے کچھ بے ضابطگیوں کی باعث سے ـــ وہ اشعار جن میں لفظ یا محاورہ غلط ہے یا قواعد کی غلطیاں ہیں۔ اگر وہ کچھ معنی بھی رکھتے ہوں تو چوں کہ محاسن شعری سے خالی ہیں اور زبان و فن پر بارِ گراں ہیں اس لئے مہملات میں شمار ہونے کے قابل ہیں۔ ایسے ہی الفاظ کی بنا پر بعض اہلِ نظر نے ان کے کچھ اشعار کو مہمل قرار دیا ہے اور ان کا یہ خیال ایک حد تک صحیح معلوم ہوتا ہے۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

---

[۱] حاشیہ ص ۳۳ آثارِ غالب

طباطبائی نے لکھا ہے کہ مہمل میرے نزدیک مہمل تو نہیں مگر مہمل کے قریب ضرور ہے۔ کیونکہ خیال اس قدر بعید الفہم ہے کہ مرزا نے خود جو اس کا مطلب لکھا ہے وہ بھی اچٹتا ہوا سا نظر آتا ہے۔ اس شعر کے متعلق مجموعۂ استفسارات جلد سوم میں نیاز فتحپوری نے بھی یہی رائے ظاہر کی ہے۔

(۲) جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہِ عشق کی
دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا

دل جانے پر دل کا درد مہمل بات ہے اگر (دل کا درد) سے مراد دل مرٹ جانے کا غم لیا جائے تو معنیٰ درست ہو سکتے ہیں لیکن شعر کے الفاظ ان معنوں کے حامل نہیں۔ اس شعر کے متعلق یہی خیال آسی نے ظاہر کیا ہے۔

(۳) عشرتِ قتلِ گہ اہلِ تمنا مت پوچھ
عیدِ نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

طباطبائی نے لکھا ہے کہ مصرعۂ ثانی میں لفظِ ہلال تنگیٔ وزن کی وجہ سے نہ آسکا اور شعر کا مطلب ناتمام رہا۔

(۴) قطرۂ مے بسکہ حیرت سے نفس پرور ہوا
خطِ جامِ مے سراسر رشتۂ گوہر ہوا

مصرعۂ اولیٰ میں لفظ نفس کو جو بہ سکون (فا) ہے بفتح باندھا ہے نفس بہ فتح (فا) سے شعر بے معنی ہو جاتا ہے اور اگر بسکون پڑھا جائے تو مصرعہ نہیں ملتا۔ طباطبائی نے اس شعر کے متعلق لکھا ہے کہ مضمون مصنف کے ذہن میں رہ گیا۔

(۵) میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد
سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

آغا باقر شرح لکھتے ہیں (عام طور پر دیوانوں کے بچے پتھر مارا کرتے ہیں۔ کہتے ہیں بچپن میں میں نے مجنوں کو مارنے کے لئے پتھر اٹھایا تھا کہ دفعتاً مجھے

اپنا سر یاد آگیا یعنی یہ خیال آیا کہ ممکن ہے کبھی میں بھی اسی طرح دیوانہ ہو جاؤں اور لڑکے مجھ کو پتھر ماریں اس لئے میں نے پتھر نہ مارا۔ مدراس کے مشہور مصنف اور شاعر جناب غنی لکھتے ہیں۔

"طبا نے جو یہ تاویل کی ہے کہ غالب کو اپنا سر یاد آگیا بالکل مہمل توجیہ ہے"۔[1]

طبا طبائی اور آسی لکھتے ہیں یہ سوچکر پتھر اپنے ہی سر میں مار لیا ظاہر ہے اس مفہوم میں کچھ لطف نہیں۔ بیشک طبا طبائی نے جو مطلب نکالا ہے وہ لطف سے خالی ہے لیکن آغا صاحب نے جو تصنیف کیا ہے وہ بھی موزوں نہیں دیوانوں کے پتھر مارنے والے لڑکے اتنے ہوشیار نہیں ہوتے کہ یہ خیال کریں کہ ہم بھی ایسے ہی ہو جائیں گے۔ کوئی لڑکا ایسا نہیں ہو سکتا جو اپنے پاگل ہونے کا خیال کرے ہاں یہ مطلب ہو سکتا ہے جو شریر لڑکوں کی شرارت کے مناسب ہے کہ اسد میں نے بچپن میں مجنوں کے مارنے کو پتھر اٹھایا فوراً مجھے خیال آیا کہ سر پر مارنا چاہیئے — حقیقت یہ ہے کہ یہ شعر مہمل ہے اور اگر کچھ مطلب بھی اس شعر کا قرار دیا جائے تو بھی مضمون نہایت بعید ہے۔

(۶) جذبۂ بے اختیار شوق دیکھا چاہیئے
سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

شمشیر کا دم یعنی اس کی تیزی کا سینۂ شمشیر سے باہر آنا کوئی معنی نہیں رکھتا ضلع جگت کے شوق میں مرزا نے چوں کہ دم کے معنی سانس کے لئے ہیں اس لئے سینۂ شمشیر اور دم کا باہر آنا باندھ دیا جو ہر طرح غلط ہے۔ نیاز فتحپوری نے بھی مجموعۂ استفسارات جلد سوم میں اس شعر کو مہمل لکھا ہے۔

(۷) ہم سخن تیشے نے فرہاد کو شیریں سے کیا
جس طرح کا کہ کسی میں ہو کمال اچھا ہے

---

[1] مدراس میں اردو صفحہ ۱۲۹

طباطبائی نے لکھا ہے کہ پہلے مصرعہ میں گنجلک ہے میں کہتا ہوں کہ مصرعہ ثانی میں تنافر ہے۔

(۸) میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا
میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

طباطبائی لکھتے ہیں کہ شاید ایسے ہی اشعار پر دلی والے کہا کرتے تھے کہ غالب بے معنی شعر کہتے ہیں۔

(۹) حالاں کہ ہے یہ سیلیٔ خارا سے لالہ رنگ
غافل کو میرے شیشے پہ مے کا گمان ہے

یہ شعر مہمل ہے اس کے متعلق اغلاط میں بحث ہے۔

(۱۰) کوئی دن گر زندگانی اور ہے
ہم نے اپنے جی میں ٹھانی اور ہے

دوسرا مصرعہ مبہم ہے۔ طباطبائیؒ نے بھی یہی لکھا ہے۔

(۱۱) نقش کو اس کے مصور پر بھی کیا کیا ناز ہے
کھینچتا ہے جس قدر اتنا ہی کھنچتا جائے ہے

تصویر بھی کھینچی جاتی ہے آدمی بھی کھنچتا ہے یعنی احتراز کرتا ہے مفہوم دونوں کا جدا جدا ہے مرزا نے یہ سمجھ کر کہ کھنچنا دونوں جگہ مستعمل ہے۔ ایک مہمل سی بات کہدی۔

میں نے نمونے کے طور پر چند شعر لکھدیئے ہیں اور کچھ آگے بھی بیان میں آئیں گے ورنہ مرزا کے بہت شعر ایسے ہیں جن کو مہمل قرار دیا جا سکتا ہے شمس العلماء پروفیسر مولانا عبدالرحمٰن دہلوی لکھتے ہیں۔

"نامانوس[۱] الفاظ اور ان کی رواں ترکیب کو فصیح کہا جاتا ہے اور

---

[۱] مرآۃ الشعراء ص۲۰ جید برقی پریس دہلی ۱۹۲۶ء بار اول

غیر سلیس الفاظ کو غیر فصیح اور ان کی ناہموار ترکیب کو ثقالت اور تنافر سے تعبیر کرتے ہیں سلاست کی ادنیٰ کسوٹی یہ ہے کہ الفاظ بولنے میں زبان پر اور سننے میں کانوں پر گراں نہ ہوں۔ اندرونِ الفاظ کی رعایت سے غرض یہ ہے کہ فہمِ کلام میں دقت نہ ہو کہ یہ بات وضوحِ معانی کے منافی ہے۔

نیاز فتحپوری لکھتے ہیں۔

"غالبؔ کے بعض وہی اشعار میری سمجھ میں نہیں آتے جو مشکل نہیں ہیں۔ الفاظ کے غلط استعمال سے پیدا ہونے والا اہمال تو غالب کے یہاں یقیناً نہیں ہے لیکن اندازِ بیان کی الجھن سے مدعا کا عنقا ہو جانا ان کے یہاں ضرور پایا جاتا ہے۔"[۱]

پروفیسر کلیم الدین لکھتے ہیں۔[۲]

"غالب کے کلام میں چند مخصوص نقائص ہیں۔ ایک تو ان کے کلام کی مخصوص ناہمواری ہے ۔۔ غالب کے اشعار صرف باعتبار طرز ہی ناہموار نہیں ناہمواری ان کے مضامین میں بھی موجود ہے ۔۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی فریاد کی کوئی لے نہیں ہے ان کا نالہ پابند نے نہیں ہے۔ اس وجہ سے غزل و شعر مفرد کی پراگندگی پر پراگندہ تر ہو جاتی ہے۔"

پروفیسر حامد حسن قادری لکھتے ہیں۔[۳]

"طویل اور پیچیدہ مرکبات ایجاد کرتے ہیں غیر مقبول تشبیہیں پیدا کرتے ہیں ۔ کہیں اشعار کو چیستاں اور معما بنا دیا ہے ۔ فارسی

---

[۱] نگار اپریل ۱۹۴۳ء [۲] اردو شاعری پر ایک نظر ص ۶۷ تا ۶۹۔
[۳] نقد و نظر ص ۱۳ تا ۱۵ و ۳۱

محاوروں کا ایسا ترجمہ کر دیا جو اردو میں مستعمل نہیں ــــــ
کفر سوز اس کا وہ جلوہ ہے کہ جس سے ٹوٹے رنگ عاشق کی طرح رونق بتخانہ صہبا
اُردو میں پہلے سے اس کا ترجمہ رنگ اڑنا رائج ہے ــــــ
تعقید معنوی پیدا کر دیتے ہیں یعنی بے موقع غیر واضح لفظ رکھ کر معنی
میں پیچ ڈال دیتے ہیں "
پروفیسر آزاد لکھتے ہیں ۔[1]
" بلکہ اکثر شعرا ایسے اعلیٰ درجۂ رفعت پر واقع ہوئے ہیں کہ ہمارے
نارسا ذہن وہاں تک پہنچ نہیں سکتے "
یہ قول ایک پروفیسر دہلی کے مشہور شاعر اردو کے مسلم الثبوت مصنف ذوق کے
شاگرد رشید کا ہے جس کلام کے معنی تک ایسے لوگوں کی رسائی نہ ہو سکے اس
کو کیا کہنا چاہیئے ۔
نیاز فتحپوری لکھتے ہیں ۔
" غالب[2] کی فارسی ترکیبوں میں اشکال لفظی کے ساتھ دقت[3] معنی بھی
ہے "
مرزا غالب کے سب سے بڑے مداح ڈاکٹر بجنوری مرحوم لکھتے ہیں ۔[4]
" دیوانِ غالب میں ایسے اشعار بھی ہیں جن کا مفہوم پانے سے
ذہن مطلقاً قاصر رہے ہے تخیل عرصۂ امکان میں ہر جانب پرواز کے
بعد مجبور واپس آجاتا ہے "
ایسے اشعار کو کیا کہنا چاہیئے ۔
شمس العلماء ڈاکٹر نذیر احمد لکھتے ہیں ۔

---

[1] آبحیات، [2] ذکر غالب [3] انتقادیات ص ۳۷ [4] رسالہ اردو اورنگ آباد
جنوری ۱۹۲۱ء مضمون محاسنِ کلام غالب بار اول

"وہ[1] بڑے مشکل گو شاعر تھے وہ ابتدا میں فارسی کہا کرتے تھے بلکہ فارسی بھی نہیں پارسی اور پارسی بھی ناآمیختہ بتازی اس پر انوکھے استعارات اچھوتی تشبیہات، لفظی تعقیدات تو ان کا کلام مشکل ہوا ہی چاہئے کوئی شخص کہتا تھا کہ ایک مرتبہ ان ہی کے شعر کے ان سے معنی پوچھے تو کچھ دیر تک تامل کرنے کے بعد فرما بیٹھے اس وقت تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کہا تھا ــ مرزا صاحب نے بادلِ ناخواستہ ریختہ کا منہ چڑانا شروع کیا

رکاکت وابتذال

مرزا غالب کے کلام میں رکاکت وابتذال کی مثالیں بھی بہت ہیں مثلاً

اسد خوشی سے مرے ہاتھ پانوں پھول گئے
کہا جو اس نے ذرا میرے پانوں داب تو دے

غالب مرے کلام میں کیوں کر مزا نہ ہو
پیتا ہوں دھو کے خسرو شیریں سخن کے پانوں

ہے خبر گرم ان کے آنے کی   آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

طباطبائی نے اس شعر کے مضمون کو سست کہا ہے۔ آسی نے رکیک قرار دیا ہے۔ دونوں قول درست ہیں۔

صحبت میں غیر کے نہ پڑی ہو کہیں یہ خو
دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کئے

ضد کی ہے اور بات مگر خو بری نہیں
بھولے سے اس نے سیکڑوں وعدے وفا کئے

---

[1] سیر المصنفین جلد اول ص۱۰ محبوب المطابع دہلی ۱۹۲۴ مصنفہ محمد یحییٰ تنہا

دے تو یوں سوتے ہیں اس کے پانوؤں کا بوسہ مگر
ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائے گا

کافی ہے نشانی تری چھلے کا نہ دینا
خالی مجھے دکھلا کے بوقتِ سفر انگشت

غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں
بوسہ کو پوچھتا ہوں میں منھ سے مجھے بتا کہ یوں

نیاز فتحپوری لکھتے ہیں۔
"غالب[1] کا کلام بھی اس سے خالی نہیں اور ابتذال و سخافت کے
اشعار ان کے یہاں بھی ملتے ہیں۔"

پروفیسر کلیم الدین لکھتے ہیں۔
"ناہمواری[2] کا سبب خیالات کی بلندی و پستی جذبات کی ندرت
و رکاکت ہے۔"

صاحب شعر الہند نے بھی مرقومہ بالا اشعار میں سے شعر نمبر دو میں رکاکت کی شکایت
کی ہے۔ پنڈت کیفی دہلوی نے اس شعر کو بھی ابتذال میں شامل کیا ہے۔

ہاتھا پائی اس سراپا ناز کا شیوہ نہ تھا[3]
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

ابتذال قریب قریب تمام اساتذہ کے کلام میں ہے مگر کم، اس کے علاوہ اُن کے
کلام کی تعداد بھی زیادہ ہے۔ مرزا صاحب کے قلیل اشعار میں اس قدر مثالوں
کا مل جانا قابلِ اعتراض ہے۔

سرقہ

سرقہ کی اقسام میں سے بعض اقسام مرزا غالب کے کلام میں پائی جاتی ہیں

---

[1] نگار جنوری ۳۶ء [2] اردو شاعری پر ایک نظر [3] کیفیہ ص ۲۴۵

ایک کھلی مثال یہ ہے۔

دیا سمن کینز ک انشا) یاد آیا مجھے گھر دیکھ کے وشت
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

(غالب) کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

اغلاط

غلطی سے کلامِ الٰہی کے سوا کسی کا کلام خالی نہیں اور نہ ہو سکتا ہے کیوں کہ بھول چوک حضرتِ انسان کے خمیر میں ہے۔

دنیا میں ہر چیز اور ہر علم و فن کے لئے ایک ضابطہ معین ہے۔ ہر ایک کام ایک قانون کے تحت چل رہا ہے جس چیز کے لئے جو قواعد ہیں اُن کی خلاف ورزی سے خرابی واقع ہوتی ہے۔ کوئی صاحبِ علم و اہل عقلِ سلیم کسی چیز کے لئے یہ تجویز نہ کرے گا کہ اس کا سر انجام قواعدِ معینہ کے خلاف کیا جائے۔

دنیا میں ہر ملک اور ہر قوم اور ہر زبان میں نظم کا فن موجود ہے اور ہر جگہ وہ کسی نہ کسی ضابطہ کے تحت رہے۔ ہمارے وطن ہندوستان کی قدیم و جدید شاعری کا یہی ضابطہ ہے انہی قواعد سے شاعر کے کلام کی جانچ کی جاتی ہے۔ اغلاط ہی کی بنا پر خوب و زشت صحیح و سقیم کا حکم لگایا جاتا ہے۔

چوں کہ غلطیاں سب سے ہوتی ہیں اور کسی کلام کو خوب و بد، اغلاط کے اقسام اور شدت و ضعف اور کثرت و قلت پر قرار دیا جاتا ہے جس کے کلام میں غلطیاں زیادہ ہیں یا شدید غلطیاں ہیں اس کا شمار اساتذہ میں نہیں کیا جاتا۔ ہاں اساتذہ کی معمولی قلیل غلطیاں نظر انداز کر دی جاتی ہیں۔ اگر کسی بڑے شاعر سے کوئی معمولی غلطی بار بار سرزد ہوتی ہے تو وہ اس کے شدید اغلاط میں شمار کی جاتی ہے۔ کلام میں کئی قسم کی غلطیاں ہوتی ہیں۔

۲۸ اغلاطِ قواعدِ صرف و نحو ۔ ۲۹ اغلاطِ قواعدِ عروض ۔ ۳۰ اغلاطِ لغت ۔ ۳۱ اغلاطِ محاورات و روزمرہ غلط استعمالِ الفاظ و محاورات ۔ یہ غلطیاں شدید اغلاط میں سے ہیں ۔

اغلاط کے ان اقسام میں سے اول الذکر چار اقسام کی غلطیوں کے جواب میں کسی استاد کی نظیر نہیں قبول کی جا سکتی کیوں کہ قواعدِ صرف و نحو و عروض و لغت و محاورات کی جس کسی نے بھی خلاف ورزی کی ہے وہ اس کی غلطی ہے محاورات میں تصرف کا کوئی شخص مجاز نہیں ہاں قسم پنجم میں اختلاف کی گنجائش ہے ۔

جو لوگ عربی فارسی میں اچھی استعداد نہیں رکھتے اور قواعدِ فن سے بے بہرہ ہوتے ہیں اور ان کا جی چاہتا ہے کہ شاعر یا مصنف بنیں یا کسی شاعر پر تنقید کریں تو وہ کہہ دیتے ہیں کہ عروض وغیرہ یہ کوئی چیز نہیں یہ پابندیاں مانع ترقی ہیں ان کے اس قول کو وہی شخص تسلیم کرے گا جو اردو زبان اور اردو شاعری کی تاریخ سے واقف نہ ہوگا یا جس کو اساتذہ کے کلام پر عبور نہ ہوگا یہی قواعد و ضوابط ہیں جن کے ذریعہ سے خودرو اردو کس مپرسی کے عالم میں نشو و نما پانے والی اردو آج دنیا کی عمدہ زبانوں میں شمار ہوتی ہے اور ایک وسیع اور علمی زبان ہے ۔

کم علم لوگ دوسری زبانوں کی شاعری کی نظیریں پیش کرتے ہیں یہ بھی کج بحثی ہے یا کم فہمی، یورپ کا قانون ہندوستان میں نہیں چل سکتا ۔ چین میں عرب کے رسم و رواج جاری نہیں ہو سکتے ۔ انگریزی گرامر پر عربی نہیں چلائی جا سکتی ۔ فارسی کی صرف و نحو فرنچ زبان میں نافذ نہیں کی جا سکتی یہ تو عیسیٰ بدین خود موسیٰ بدینِ خود کا معاملہ ہے ۔ پروفیسر عبدالقادر سروری ایم اے ۔ ایل ایل بی لکھتے ہیں ۔

"ہر زبان کا ماحول مخصوص ہوتا ہے انگریزی معاشرت کے

---

۵۱ جدید اردو شاعری ص ۳۴ مرکنٹایل پریس لاہور ۱۹۳۹ء

پورے ہماری ادبیات میں اچھی طرح بار آور نہیں ہو سکتے ؛
ادب علوم و فنون کی بنیاد ہے اگر بنیاد بے قاعدہ ہو گی تو اوپر کی تمام عمارتیں بے قاعدہ اور کمزور ہو جائیں گی۔ شاعری علم ادب کی روح رواں ہے۔ شعر الفاظ و محاورات وغیرہ کے متعلق سند میں پیش کیا جاتا ہے اس لیئے شعر میں ان امور کی درستی فرض ہے بغیر ان کی درستی کے کلام کو شعر نہیں کہا جائے گا بلکہ تک بندی کا لقب دیا جائے گا۔

مسٹر یوسف جمال انصاری، ایم اے لکھتے ہیں۔

"اردو[۱] ادب میں شعر کی تعریف یہ ہے کہ وہ باوزن ہوتا ہے مقفیٰ ہوتا ہے۔ اردو شاعری میں وزن و قافیہ بنیادی حقیقت رکھتے ہیں:

ادب کے معنی لغت میں زیرکی اور نگہداشت کے ہیں۔ اصطلاحاً علم ادب وہ علم ہے جس کے ذریعے سے انسان کلام میں خطا اور غلطی کرنے سے بچے اور وہ بارہ علم ہیں۔ لغت۔ صرف۔ نحو۔ اشتقاق۔ معانی۔ بیان۔ عروض۔ قافیہ۔ آٹھ اصول ہیں باقی چار فروع ہیں۔ علم رسم الخط۔ علم قرض الشعر یعنی وہ علم جس سے شعر کا حسن و قبح معلوم کیا جاتا ہے۔ علم انشائے نثر۔ علم محاضرات۔ یعنی علم تاریخ (کذا ذکرہ صاحب منتہی الادب و ابن خلدون)

پروفیسر کلیم الدین احمد لکھتے ہیں۔

"عالم[۲] میں ہر جگہ توازن کی جلوہ گری ہے تمام اتفاق کا سر و د نظر آتا ہے۔ قوانینِ عالم گویا کسی حسین رقص پر مبنی ہیں یہی اتفاقِ قدر کن ادرقص کا نقشہ دیتا ہے ادب میں عموماً اور دنیائے شاعری میں خصوصاً نظر آتا ہے شاعری میں اس حسن کی تصویر مناسب الفاظ و نقوش اور اوزان کی مدد سے کھینچی جاتی ہے۔

---

[۱] رسالہ عالمگیر لاہور خاص نمبر ۱۹۳۶ء [۲] اردو شاعری پر ایک نظر ص۱

نیاز فتحپوری لکھتے ہیں۔

"بہترین[1] شعر وہ ہے جو فنی اور جذباتی لحاظ سے کسی تغیر و تبدل کا متحمل نہ ہو"

پروفیسر حامد حسن قادری لکھتے ہیں۔

"شاعری[2] کے لئے عروض بمنزلہ پیمانہ و ترازو ہے۔ اساتذہ قدیم نے فن عروض کی تحصیل واجب و ناگزیر قرار دی ہے زبان وادب بھی مثل انسانوں کے جاندار چیزیں ہیں جس طرح مطلق بے قیدی سے جسم و روح تباہ ہوجاتے ہیں۔ اسی طرح بے اصولی اور بے راہ روی سے زبان وادب کی بربادی یقینی ہے جس طرح بے دینی و بداخلاقی کی زندگی میں روح جسم کے اندر موجود ہوتی ہے لیکن صداقت و دیانت کے عالم میں اس روح پر موت وارد ہوچکتی ہے۔ اسی طرح بے قاعدہ اور خلاف معیار انشار پردازی میں زبان و ادب موجود ہوتے ہیں لیکن ذوق سلیم کے نزدیک ان کا خاتمہ ہوچکتا ہے"

جو لوگ قواعد فن کی خلاف ورزی کرتے ہیں یا اس کے مؤید ہیں وہ اپنی پردہ پوشی کے لئے یورپ وغیرہ کی آڑ پکڑتے ہیں لیکن اصل سبب یہ ہے کہ قابلیت و علمیت کافی نہیں اور جی چاہتا ہے شاعر اور مصنف اور نقاد بننے کو شوکت تھانوی نے خوب کہا ہے۔

شاعر اسی فی صدی تعلیم سو میں پانچ کی۔

بے راہ روی اختیار کرنے والوں کے لئے اردو کے مشہور شعرا اور اساتذہ میں مرزا غالب سے بہتر مثال نہیں مل سکتی اسی لئے وہ غالب پر فدا ہیں

---

[1] نگار اکتوبر ۱۹۶۳ء [2] نقد و نظر ص۱۰۵ و ۱۲۰

اور ان کی اغلاط کی اس ہی دلیل سے حمایت کرتے ہیں کہ یہ قواعد وغیرہ مانع ترقی ہیں۔

جدت طراز دہلوی شاعر پنڈت کیفی لکھتے ہیں۔

"اب[1] آزادہ روی بے راہ روی کی صورت اختیار کرنے لگی ہے۔۔۔ اس قسم کی طباعی سے اردو نظم محروم ہی رکھی جائے تو اچھا ہے۔"

شعر کے متعلق ایک انگریز فاضل کا قول ہے۔

"مگر[2] وزن سے بلاشبہ اس کا اثر زیادہ تیز اور اس کا منتر زیادہ کارگر ہو جاتا ہے۔"

پنڈت کیفی لکھتے ہیں۔

"پوئٹری[3] اور ورس کے جو بھی معنی انگریزی لغات میں دیئے گئے ہیں ان میں وزن کی قید دونوں کے لئے ہے۔"

پروفیسر کلیم الدین لکھتے ہیں۔

"زبان[4] کو اردو میں ہمیشہ شاعری پر ترجیح دی گئی ہے۔"

مولانا عبدالمجید لکھتے ہیں۔

"شعر[5] در اصل لغت دانستن است و از روئے اصطلاح سخنے است اندیشیدہ مرتب معنوی موزوں متکرر متساوی ۔۔۔ اس تعریف میں مرتب معنوی ہذیان سے احتراز اور موزوں نثر سے احتراز ہے۔"

مولوی شبلی نعمانی لکھتے ہیں۔

"مضمون کتنا ہی بلند اور نازک ہو لیکن اگر الفاظ مناسب نہیں

---

[1] کیفیہ ص۲۹۵ [2] مقدمہ شعر و شاعری بر دیوان حالی ص۳۱ مطبوعہ بار اول
[3] کیفیہ ص۳۰۲ بحوالہ آکسفورڈ ڈکشنری [4] اردو شاعری پر ایک نظر ص۲
[5] حدیقۃ ارم ص۱ عالمگیر الکٹرک پریس لاہور ۱۹۳۳ء [6] شعر العجم حصہ چہارم ص۲۵ نگینہ سٹیم پریس لاہور

ہیں تو شعر میں کچھ تاثیر پیدا نہ ہو سکے گی اس لئے شاعر کو یہ سوچ لینا چاہیئے کہ جو مضمون اُس کے خیال میں آیا ہے اسی درجہ کے الفاظ اس کو میسر آ سکیں گے یا نہیں اگر نہ آ سکیں تو اس کو بلند مضامین چھوڑ کر سادہ اور معمولی مضامین پر قناعت کرنی چاہیئے۔

فارسی کے ایک استاد کی رباعی ہے۔

تو شعر نگو کلام لایعنی را | در شعر و سخن رہ نبود اعمٰی را
لطفیست بتیم در کثارت معنی | لفظے باید کہ پرورد معنی را

مرزا سودا فرماتے ہیں۔

کامل فن سخن کہتے ہیں اس کو اکمل
پرورش لفظ کی منظور ہو جس کو اول

اردو ہی پر منحصر نہیں ہر زبان کی شاعری میں صحت الفاظ و محاورات کا پورا لحاظ کیا جاتا ہے اور ان کی خلاف ورزی پر ایسا شعر مسترد کر دیا جاتا ہے۔

مولوی شبلی نعمانی لکھتے ہیں۔

"لفظ جسم ہے اور مضمون روح ہے دونوں کا ارتباط باہم ایسا ہی ہے جیسا روح و جسم کا ارتباط — اگر معنی میں نقص نہ ہو اور لفظ میں ہو تو شعر میں عیب سمجھا جائے گا جس طرح لنگڑے یا بھجے میں روح موجود ہوتی ہے لیکن بدن میں عیب ہوتا ہے — زیادہ تر اہل فن کا مذہب یہی ہے کہ لفظ کو مضمون پر ترجیح ہے حقیقت یہ ہے کہ شاعری یا انشا پردازی کا مدار زیادہ تر الفاظ ہی پر ہے"[1]

ڈاکٹر زور لکھتے ہیں

"ہمارے شاعر ہمیشہ خیالات پر زبان کو ترجیح دیتے رہے ہیں"[2]

---

[1] شعر العجم حصہ چہارم ص۵۵ نیر پریس لکھنؤ ۱۹۲۳ء [2] روح تنقید حصہ دوم ص۵

سید مسعود حسن رضوی ایم اے شعر کی لفظی خوبیوں کے متعلق لکھتے ہیں۔
"سادگی یعنی مشکل الفاظ استعمال نہ کئے جائیں۔ لفظوں کی ترتیب،
قواعدِ زبان اور بیان کے مطابق ہو"[1]

شمس العلماء پروفیسر مولانا عبد الرحمٰن دہلوی لکھتے ہیں۔
"وہ موزوں و مقفیٰ کلام جو عکس جذبات ہونے کے ساتھ ساتھ
حسنِ زبان و بیان کا مجموعہ ہوتا ہے شعر یا اچھا شعر کہلاتا ہے۔

مرزا غالب کے اغلاط کو اگر تفصیل سے لکھا جائے تو ان کے دیوان سے زیادہ ضخیم کتاب طیار ہو جائے۔ ان کے کلام میں لغت، صرف و نحو تحاور روزمرہ غرض ہر قسم کی غلطیاں ہیں۔ ان کے اکثر اشعار ضوابطِ فصاحت و بلاغت کے خلاف ہیں۔ ان کی لغزشیں اور غلطیاں اس قسم کی ہیں جو کم علم اور نوآموز شاعر سے سرزد ہو سکتی ہیں۔ میں ان کی اغلاط کو گھٹا کر بیان کرنا چاہتا ہوں بعض اغلاط کو نظر انداز کرتا ہوں۔ غالب کے شارحوں اور مداحوں مثل طباطبائی حسرت پروفیسر قادری۔ مولانا ذوالفقار علی مرحوم صاحب تذکرۃ البلاغت مرزا صاحب کے اور بعض مداحوں نے جن اغلاط کو قبول کیا ہے ان کو اور اسی قسم کی دوسری غلطیوں کو لکھوں گا بعض اصحاب نے ایسی غلطیاں بھی ظاہر کی ہیں جو میرے خیال میں کچھ وزن نہیں رکھتیں اس قسم کی غلطیوں کو میں نے چھوڑ دیا ہے مثلاً

(۱) نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

مولانا ذوالفقار علی صاحب مرحوم نے لکھا ہے کہ چوں کہ پہلے مصرعہ میں تکرار

---

[1] ہماری شاعری صفحہ ۹ نظامی پریس بدایوں ۱۹۲۶ء ص ۵ مرأۃ الشعراء صفحہ ۳ جید برقی پریس دہلی ۱۹۲۶ء۔

ہے لہذا یہ خلاف فصاحت ہے۔ یہ ایک ایسا اعتراض ہے کہ محاسن کثیر کے مقابلہ میں اس کو میں نظر انداز کرنے کے قابل سمجھتا ہوں۔

(۲) دل لگا کر آپ بھی غالب مجھی سے ہو گئے
عشق سے آتے تھے مانع میرزا صاحب مجھے

اس غزل کے قافیے (لب۔ رب وغیرہ) ہیں اس لئے (صاحب) کی (حا) پر (فتح) پڑھا جائے گا اور صحیح لفظ (حا) بالکسر ہے میرے نزدیک یہ اعتراض صحیح نہیں عربی لفظ (صاحب) ضرور بالکسر ہے لیکن اردو بالفتح رائج ہے اس لئے غلط العام ہے اس کا باندھنا صحیح ہی نہیں بلکہ فصیح ہے۔

(۳) ہمیں پھر ان سے امید اور انھیں ہماری قدر
ہماری بات ہی پوچھیں نہ وہ تو کیوں کر ہو

اس شعر پر یہ اعتراض ہے کہ مصرعہ ثانی میں (وہ) کی جگہ (وو) لائے ہیں لیکن میرے نزدیک یہ اعتراض غلط ہے۔ غالب کے زمانے میں ایسا رواج تھا ظفر کا شعر ہے۔

یا آئے اجل یا صنم عربدہ جو آئے
ایسا نہ ہو یا رب کہ نہ یہ آئے نہ وو آئے

(۴) نالہ جاتا تھا پرے عرش سے میرا اور اب
لب تک آتا ہے جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے

اس شعر پر یہ اعتراض ہے کہ پہلے مصرعہ میں لفظ (میرا) بیکار ہے لیکن یہ صحیح نہیں اگر (میرا) نہ ہوتا تو تعمیم ہو جاتی کہ نہ معلوم کس کا نالہ تھا اور کس کے لب تک آیا شعر مہمل ہو جاتا اس لئے (میرا) بیکار نہیں۔

اس قسم کے اور بھی اعتراض ہیں جن کو میں نے نقل نہیں کیا، اس اظہار

۱ے تذکرۃ البلاغت ص۳۶ مطبع مجتبائی دہلی ۱۹۰۰ء

سے یہ مقصد ہے کہ ہیں مرزا صاحب پر خواہ مخواہ اور کمزور اعتراضات کرنے نہیں چاہتا بلکہ واقعی اور شدید اغلاط کو ظاہر کرنا مدنظر ہے۔

شعر میں اول یہ دیکھا جاتا ہے کہ الفاظ و محاورات صحیح ہیں یا نہیں پھر باعتبارِ صرف و نحو و عروض اس پر نظر کی جاتی ہے اس کے بعد فصاحت و بلاغت کی طرف توجہ کی جاتی ہے۔

بلیغ وہ شعر سمجھا جاتا ہے کہ جو فصیح اور موافقِ مقتضائے حال و مقام ہو۔ فصیح وہ کلام ہوتا ہے جس کے الفاظ بروئے لغت صحیح ہوں، محاورات موافق استعمالِ اہلِ زبان ہوں اور عیوب مرقومہ ذیل سے پاک ہو۔

ضعفِ تالیف یعنی ترکیبِ کلام خلاف قواعد نحو ہو یا استعمال الفاظ و محاوراتِ اہلِ زباں کے خلاف ہو۔

تعقید لفظی یعنی تقدیم یا تاخیر یا حذف وغیرہ کی وجہ سے کلام میں خلل واقع ہو جائے۔

تعقید معنوی یعنی وسائطِ کثیرہ اور لوازمِ بعیدہ کا ہونا جن کے ذریعہ سے متکلم کی مطلب تک رسائی ہو سکے۔

تنافر، قریب المخرج یا بعید المخرج الفاظ کا مجتمع ہو کر زبان پر ثقیل ہو جانا۔

کثرتِ تکرار، ایک لفظ کا کئی بار آنا۔

کثرتِ اضافات، ایک مصرعہ یا شعر میں کئی اضافتوں کا ہونا۔

اور بھی عیوب ہیں لیکن یہ ایسے صریح عیوب ہیں کہ ان سے نو آموز شاعر بھی بچتا ہے۔ غرض یہ ہے کہ کلام فصیح و بلیغ ہونا چاہیئے غزل مثنوی قطعہ وغیرہ میں سادگی ہو اور عام فہم زبان ہو قصیدے میں الفاظ شاندار ہوں۔ مولوی شبلی نعمانی لکھتے ہیں۔ [۱]

الفاظ متعدد قسم کے ہوتے ہیں بعض نازک لطیف شستہ صاف رواں

---

[۱] شعر العجم حصہ چہارم صہ ۵۹

شیریں اور بعض پُرشوکت متین بلند پہلی قسم کے الفاظ عشق و محبت کے مضامین ادا کرنے کے لئے موزوں ہیں ۔ شاعر پر بھی نہایت ضروری ہے کہ فصیح اور مانوس الفاظ کا تفحص کرے اور کوشش کرے کہ کوئی لفظ فصاحت کے خلاف نہ آنے پائے ۔۔۔ غرض یہ کہ شاعر جس طرح مضامین کی جستجو میں رہتا ہے اس کو ہر وقت الفاظ کی جانچ پڑتال اور ناپ تول میں بھی مصروف رہنا چاہیئے ۔

احسن مارہروی لکھتے ہیں ۔
"شعر کی بڑی خوبی یہی سمجھی جاتی ہے کہ ادھر قائل کے منہ سے نکلا اور اُدھر سننے والے کے دل میں اتر گیا"[1]

نیاز فتحپوری لکھتے ہیں ۔
"خیال کی دقت اور بیان کی ژولیدگی غزل میں میرے نزدیک نہایت مکروہ چیز ہے ۔ایک غزل کے شعر کا مطلب یہ ہے کہ اس کو سنتے ہی مفہوم ذہن نشین ہو جائے اور انسان کو سوچنا نہ پڑے ۔[2]

خواجہ حالی لکھتے ہیں :
"خیال کیسا ہی بلند اور دقیق ہو مگر پیچیدہ اور ناہموار نہ ہو اور الفاظ جہاں تک ہوں محاورہ اور روزمرہ کی بول چال کے قریب ہوں جس قدر شعر کی ترکیب معمولی بول چال سے بعید ہو گی اسی قدر سادگی کے زیور سے معطل سمجھی جائے گی "[3]

ملٹن کا قول ہے عمدہ نظم وہ ہے جس میں سادگی اور نازک خیالی ہو مولوی عبدالسلام ندوی بحوالہ کتاب العمدہ لکھتے ہیں ۔

---

[1] احسن الانتخاب صفحہ ۲ [2] مجموعہ استفسارات جلد سوم صفحہ ۳۹ مطبوعہ مختار پریس لکھنؤ ۱۹۳۸ء [3] مقدمہ شعر و شاعری صفحہ ۵۵

"غزل[1] کے الفاظ شیریں لچکدار اور قریب الفہم ہوں غیر پیچیدہ اور واضح ہونے چاہئیں اس کے لئے ایسا کلام اختیار کرنا چاہیئے جو ظاہر المعنی نرم تر اور صاف شفاف ہو"

مسٹر رشید احمد پروفیسر مسلم یونیورسٹی لکھتے ہیں۔

"غزل[2] کے لئے سادہ زبان اور صاف بیان کی قید ہے"

مولوی محمد زکریا خاں زکی شاگرد غالب فرماتے ہیں۔

نہیں مطبوع زکی ہم کو کلامِ مہمل
قابلِ فہم ترے معنیِ دشوار نہیں

استاد قائم چاندپوری فرماتے ہیں۔

گفتگو صاف عجب لطف رکھے ہے قائم
گرچہ ہیں شعر کے واقع میں سب اقسام لذیذ

نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ فرماتے ہیں۔

وہ طرز فکر ہم کو خوش آتی ہے شیفتہ
مضموں شگفتہ لفظ خوش انداز صاف ہو

ان امور پر نظر کرنے کے بعد مضمون کی لطافت، خیالات و جذبات کی نزاکت تشبیہات و استعارات کی رفعت و ندرت پر نظر کی جاتی ہے۔

خواجہ حالی لکھتے ہیں۔

"شاعر[3] کا یہ فرض ہے کہ مجاز و استعارہ و کنایہ و تمثیل وغیرہ کے استعمال پر قدرت حاصل کرے"

حکیم مولوی عبد الحی لکھتے ہیں۔

"بعض[4] مضامین ایسے دلچسپ اور دل کش ہوتے ہیں کہ ان کو محض

---

۱ شعر الہند حصہ دوم صفحہ ۹۳ ۲ مخزن الادب صفحہ ۱۸۹ ۳ مقدمہ شعر و شاعری صفحہ ۱۵۲
۴ گل رعنا صفحہ ۵۸ و ۶۸

صفائی اور سادگی سے بیان کر دینا کافی ہوتا ہے مگر بہت سے خیالات
ایسے ہوتے ہیں کہ معمولی زبان ان کو ادا نہیں کر سکتی اور معمولی اسلوب
ان میں اثر پیدا کرنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر تشبیہہ
استعاروں یا کنایہ اور تمثیل سے کام لینے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اگر
ایسا نہ کیا جائے تو شعر شعر نہیں رہتا معمولی بات چیت ہو جاتی ہے
اس میں شاعر کی سلیقہ مندی کی سخت ضرورت ہے کہ وہ اس کو
صنعت در صنعت یا استعارہ در استعارہ کر کے بعید الفہم نہ کر دے۔
تشبیہہ و استعارہ بجائے خود نہایت عمدہ چیز ہے جس وقت گفتگو کا
معمولی انداز جوش پیدا کرنے سے قاصر رہتا ہے تو اس کے ذریعہ
سے کلام میں زور اور قوت پیدا کرنی پڑتی ہے یہ شیریں کلام کو
خوبصورت بھی کرتی ہے۔۔ تشبیہہ اور استعارہ قریب المأخذ
ہوں یعنی آس پاس کے ہوں اور آنکھوں کے سامنے ہوں تو کلام
میں لطافت و نزاکت پیدا ہو جائے گی اور اگر دور جا پڑیں اور
بہت باریک پڑ جائیں تو دقت پیدا ہو جائے گی۔"
ان اوصاف کے بعد شعر میں سوز و گداز کا پایا جانا ضروری ہے اور آخر یہ کہ
موسیقی کی موافقت کرتا ہو۔
ان بیانات پر نظر کرنے کے بعد اب مرزا صاحب کے اشعار پر توجہ کیجئے

(۱) کاوے کاوے سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

مضمون اچھا ہے شعر بھی اچھا ہے مگر (کاوے کاوے) سخت کرخت مکروہ وغیر
مانوس لفظ ہے شعر کو بگاڑ دیا ہے۔

(۲) یک الف بیش نہیں صیقل آئینہ ہنوز
چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا

جیش نہیں بیان حصر کے لئے ہے مگر اردو نحو اس کی متحمل نہیں ہے۔

(۳) پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
دل جگر تشنۂ فریاد آیا

مصرعہ ثانی میں (یاد ہوا) کے معنی میں ہے جو فارسی کا محاورہ ہے اردو میں اس طرح نہیں بولتے۔

(۴) شوق ہر رنگ رقیب سر و ساماں نکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

(ہر رنگ) محاورہ نہیں (ہر طرح) محاورہ ہے۔

(۵) شمار سبحہ مرغوب بتِ مشکل پسند آیا
تماشائے بیک کف بردنِ صد دل پسند آیا

تعقید ہے بندش سست ہے اس شعر کے متعلق آسی صاحب لکھتے ہیں کہ ایسے مضمون کو کوہ کندن اور کاہ برآوردن سے زیادہ وقعت نہیں دی جاسکتی۔

(۶) جیف اُس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

حسرت موہانی لکھتے ہیں کہ دونوں مصرعوں میں (قسمت) کے تکرار نے بے لطفی پیدا کردی ہے۔

(۷) کوئی مرے دل سے پوچھے ترے تیر نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

طباطبائی لکھتے ہیں (جو) کا (واؤ) وزن سے ساقط ہے اور یہ درست بلکہ فصیح ہے لیکن اس کے ساقط ہوجانے سے دو (جیم) جمع ہوگئے اور تنافر پیدا ہوگیا لیکن خوبیٔ مضمون کہ ایسی باتوں کا کوئی خیال نہیں کرتا۔ میں عرض کرتا ہوں کہ زبان وفن کو عاشقانہ مضمون کی خوبی پر قربان کرنا ذوق زبان وفن کے خلاف ہے جن اشعار میں لغات وفن کی غلطیاں ہوں ان کو پسند کرنا مذاقِ سلیم

کا کام نہیں شعر اور مضمون جیسی کا رہ آمد اور عمدہ ہوتا ہے جب کہ شعر اپنے معیار پر صحیح ہو۔

(۸) مے وہ بہت کیوں پیتے بزمِ غیر میں یارب
آج ہی ہوا منظور ان کو امتحاں اپنا

یہ شعر مہمل ہے (پیتے) کی جگہ اگر (پے گئے) ہوتا تو شعر صحیح ہو جاتا آغا محمد باقر نے اس کی شرح میں لکھا ہے کہ محبوب نے بزمِ غیر میں حد سے زیادہ شراب اس لئے پی ہے کہ اس کو یہ اندازہ لگانا مقصود تھا کہ وہ کتنی شراب پی سکتا ہے (لیکن یہ مطلب بغیر پی گئے کے حاصل نہیں ہوتا) لمبا طباطبائی لکھتے ہیں۔ پے گئے کے مقام پر مصنف نے پیتے باندھا ہے جس سے یہ معنی نکلتے ہیں کہ بھلا بزمِ غیر میں وہ کیوں بہت شراب پیتے یہ میری بدقسمتی ہے کہ آج میرے گھر میں آئے تو بہت سی شراب پی گئے (شعر سے یہ مطلب نکالنا فضول ہے)

(۹) کچھ نہ کی اپنے جنونِ نارسا نے ورنہ یاں
ذرہ ذرہ روکشِ خورشیدِ عالمتاب تھا

(کچھ نہ کی) غلط ہے (کچھ نہ کیا) ہونا چاہیے۔ آغا باقر نے (کچھ نہ کیا) ہی لکھ کر شرح کی ہے۔

(۱۰) رہزنی ہے کہ دل ستانی ہے
لے کے دل، دل ستاں روانہ ہوا

قافیہ معمولہ کے عیب نے شعر کو بھدا کر دیا ہے۔

(۱۱) اسدؔ ہم وہ جنوں جولاں گدائے بے سروپا ہیں
کہ ہے سر پنجۂ مژگانِ آہو پشتِ خار اپنا

مضمون مشکل ہے الفاظ ثقیل و غریب ہیں جن کی کوئی شخص تعریف نہیں کر سکتا اس شعر کو اور دیگر چند ایسے ہی اشعار کو لکھ کر حسرت موہانی نے بھی یہی رائے ظاہر کی ہے ذوق نے بھی (پشتِ خار) باندھا ہے زبان کی صفائی بندش کی چستی

قابلِ دید و داد ہے۔

مجنوں نے دی لگا جو سرِ خار تار پشت
پشت اب ہجومِ خار سے ہے پشتِ خار پشت

(۱۲) دل اس کو پہلے ہی ناز و ادا سے دے بیٹھے
ہمیں دماغ کہاں حسن کے تقاضا کا

(تقاضا کا) غلط ہے (تقاضے کا) صحیح محاورہ ہے۔

(۱۳) آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے
صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

تعقید ہے۔

(۱۴) جلوہ گل نے کیا تھا واں چراغاں آب جو
یاں رواں مژگانِ چشمِ تر سے خونِ ناب تھا

آبجو کے بعد (کو) علامتِ مفعول حذف ہے یہ جائز نہیں۔

(۱۵) خوش ہو اے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا
باندھ شہزادہ جواں بخت کے سر پر سہرا

(ترے سر سہرا) غلط ہے یہ محاورہ نہیں ہے۔ مرزا نے محاورے میں تصرف کیا ہے اور یہ جائز نہیں[۱] اس اعتراض کو سب نے تسلیم کیا ہے۔ طباطبائی نے بھی اس اعتراض کو شرحِ دیوانِ غالب میں پیش کیا ہے اور آغا محمد باقر اس کے متعلق لکھتے ہیں۔

"افسوس[۲] ہے مرزا پورا محاورہ نظم نہیں کر سکے محاورے میں خالی سہرا نہیں بولا جاتا۔ ظاہر کرنا چاہئے تھا کہ کس چیز کا سر سہرا ہے شعر

---

[۱] شعر الہند حصہ دوم ص ۳۸۴ [۲] بیانِ غالب ص ۶۲۲ بار اول ۱۹۴۰ء عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور۔

کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے اصل سہرا مراد ہے حالاں کہ مصنف کا مفہوم یہ نہیں ہے استاد ذوق نے اپنے مطلع میں یہ کمی پوری کر دی ہے۔

(۱۶) جبکہ اپنے میں سماوے نہ خوشی کے مارے
گوندھے پھولوں کا بھلا پھر کوئی کیوں کر سہرا

اس شعر کے متعلق مولوی عبدالسلام ندوی لکھتے ہیں۔

"ذوق[۱] کی بندش اچھی ہے غالب کے شعر میں تخئیل پائی جاتی ہے جو سادگی کے منافی ہے۔"

سہرے کے متعلق نواب امداد امام اثر لکھتے ہیں۔

"سہرے[۲] کی تصنیف میں کبھی دشوار مضامین کو دخل دینا نہیں چاہیئے۔ اس میں خوش خرمی اور ہلکے پھلکے شادی بیاہ کے مضامین حوالۂ قلم کئے جاتے ہیں۔ سہرے میں عربی کی مضمون آوری کی کوئی حاجت نہیں۔ اس لئے ذوق نے معمولی مضامین کو شاعری کی خوبیوں کے ساتھ اس طور پر موزوں کیا ہے کہ ہر خاص و عام کو پسند آتا ہے اس کے بخلاف غالب کا سہرا اُن کے مذاقِ غزل گوئی کا رنگ رکھتا ہے۔ الفاظ کی بندش کا انداز بھی وہی ہے جو ان کی غزل گوئی میں اکثر قائم رہتا ہے مثلاً حُسنِ دل افروز۔ طرفِ کلاہ۔ رگِ ابرِ گہربار۔ گراں باری گہر۔ اس لئے ان کا سہرا سہرے کے تقاضے کی موافق نہیں ہے۔"

شہزادہ مرزا جواں بخت کی شادی ۱۸۵۱ء میں ہوئی اس لئے یہ سہرا مرزا کی ۱۸۵۱ء کی شاعری کا نمونہ ہے۔

۱ء شعر الہند حصہ دوم ص ۳۸۷ ۲ء کاشف الحقائق حصہ دوم، ذکرِ غالب

(۱۷) دُکھ جی کو پسند ہو گیا ہے غالب

دل رُک رُک کے بند ہو گیا ہے غالب

کہتے ہیں کہ مصرعۂ ثانی میں ایک (رک) زاید ہے۔ طبا طبائی اور آغا باقر نے لکھا ہے کہ غالب کے صحیح کئے ہوئے نسخے میں ایک (رک) ہے میں عرض کرتا ہوں کہ اس صورت میں یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ محاورہ رک رک کی نہیں رک رک کی ہے۔ مرزا نے خود اس محاورے کو اس ہی طرح باندھا ہے۔

میں بھی رُک رُک کے نہ مرتا جو زباں کے بدلے

دشنہ اک تیز سا ہوتا مرے غمخوار کے پاس

(مومن) رُک رک کے دم پیری دم آنے کو کیا کہئے

جینے کا یہ عالم ہے مرجانے کو کیا کہئے

(ذوق) دمبدم رک رک کے ہے منھ سے نکل پڑتی زباں

وصف اس لالہ چکلے فوارے یا کہنے کو ہیں

(۱۸) چشم مار وشن کہ اس بیدرد کا دل شاد ہے

دیدہ پُرخوں ہمارا ساغرِ سرشارِ دوست

آغا محمد باقر لکھتے ہیں کہ مصرعۂ ثانی میں (ہے) محذوف ہے اور یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ میں عرض کرتا ہوں کہ (ہے) کلمۂ ایجاب ہے اس کا حذف جائز نہیں اور چشمِ ما روشن اور دل شاد یہ خوشی کے موقع پر بولا جاتا ہے یہاں بے محل ہے۔

(۱۹) کمالِ گرمیٔ سعیٔ تلاشِ دید نہ پوچھ

برنگِ خار مرے آئینہ سے جوہر کھینچ

مرزا غالب کے خاص مداح پنڈت کیفی دہلوی نے اس شعر میں توانائی اضافت[۱]

۱؎ کیفیہ صفحہ ۲۴۳

کے عیب کی شکایت کی ہے اور یہ صحیح ہے۔ تعقید بھی ہے۔

(۲۰) فنا تعلیمِ درسِ بے خودی ہوں اُس زمانے سے
کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر

(فنا تعلیم) سے یہ مطلب ہے کہ فنا کی تعلیم پائے ہوئے یہ ترکیب فارسی میں بھی نامانوس ہے اور فنا تعلیم کی اضافت درسِ بے خودی کی طرف اور بھی پیچ در پیچ ہے درس کے لفظ کی اس مفہوم کے لئے ضرورت نہ تھی (فنا تعلیم بے خودی) کافی تھا درس نے ایک حشو اور ایک اضافت بڑھا دی۔

(۲۱) ہم عبادت کو ترا نقشِ قدم مہرِ نماز
ہم ریاضت کو ترے حوصلہ سے استظہار

اس شعر میں (ہم) یہ لفظ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ طبا طبائی نے بھی یہ اعتراض کیا ہے۔

(۲۲) کیا بدگماں ہے مجھسے کہ آئینہ میں مرے
طوطی کا عکس سمجھے ہے زنگار دیکھ کر

آئینہ اور طوطی کے مستعار لۂ واضح نہیں اگر استعارہ نہ مانا جائے اور آئینہ اور طوطی کے حقیقی معنی مراد ہوں تو مضمون نہایت سخیف ہو جاتا ہے کہ معشوق کو بدگمانی ہے کہ غالب طوطی پالتا ہے اگر آئینہ سے آئینۂ دل اور طوطی کے عکس سے کسی دوسرے معشوق کی تصویر مراد لی جاتی ہے تو اس کے لئے کوئی قرینہ نہیں

(۲۳) اسد اللہ خاں تمام ہوا
اے دریغا وہ رندِ شاہد باز

شاہد باز یہاں حسن پرست عاشق مزاج کے معنی میں استعمال ہوا ہے یہ غلط ہے شاہد باز اصطلاح میں فاسق کو کہتے ہیں۔ (چراغِ ہدایت)

(۲۴) فروغِ عشق سے ہوتی ہے حلِ مشکلِ عاشق
نہ نکلے شمع کے پا سے نکالے گر نہ خار آتش

مل بالاتفاق مذکر ہے مرزا نے مؤنث باندھا ہے اور مصرعۂ ثانی میں تنافر ہے۔

(۲۵) پیچھے ڈالی ہے سرِ رشتۂ اوقات میں گانٹھ
پہلے ٹھونکی ہے بنِ ناخنِ تدبیر میں کیل

گانٹھ مکروہ اور بھدّا لفظ ہے گرہ باندھنا چاہیئے تھا مرزا کے زمانہ میں گرہ کا لفظ رائج تھا۔ مرزا نے ایک اور جگہ بھی یہ لفظ استعمال کیا ہے۔

یہ دی جو گئی ہے رشتۂ عمر میں گانٹھ
ہے صفر کہ افزائشِ اعداد کرے

مرزا نے خود گرہ کا لفظ بھی استعمال کیا ہے۔

ہر سیکڑے کو ایک گرہ فرض کریں
ایسی گرہیں ہزار ہوں بلکہ سوا

(۲۶) ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں
کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں

(التہاب) اردو میں نامانوس ہے اور مصرعہ پر بھاری ہے۔

(۲۷) ذکر میرا بہ بدی بھی انھیں منظور نہیں
غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دُور نہیں

(بہ بدی) میں تنافر ہے اس مرض میں مرزا کے بہت سے اشعار مبتلا ہیں۔

(۲۸) نفی سے کرتی ہے اثبات تراوش گویا
دی ہے جائے دہن اس کو دمِ ایجاد نہیں

(اثبات) مذکر ہے یہاں مؤنث باندھا ہے میر کا شعر ہے۔

تابوت مرا دیر اٹھا اُس کی گلی سے
اثبات ہوا جرم محبت کا اسی سے

دوسری جگہ مرزا نے خود بھی مذکر باندھا ہے۔

ہے رنگِ لالہ و گل و نسریں جدا جدا
ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیئے

(۲۹) تماشا کر اے محوِ آئینہ داری
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

(محوِ آئینہ داری) یعنی دیکھنے میں جو محو ہے یعنی معشوق مراد ہے اس موقع پر (آئینہ داری) غلط ہے (آئینہ داری) ایک خدمت ہے جو بیگمات کی لونڈیاں باندیاں اور امیروں کے نوکر چاکر انجام دیتے ہیں۔

(۳۰) کفر سوز اس کا وہ جلوہ ہے کہ جس سے ٹوٹے
رنگِ عاشق کی طرح رونقِ بت خانۂ چین

(رنگ ٹوٹنا) اور (رونق ٹوٹنا) اردو کے محاورے کے خلاف ہے (وہ) کے معنی (ایسا) کے ہیں یہ لفظ (کفر سوز) سے پہلے آنا چاہیئے تھا (وہ جلوہ) کہنے سے غلط فہمی پیدا ہوتی ہے معلوم ہوتا ہے کہ (وہ) (جلوہ) کے لئے اسم اشارہ ہے۔ ترکیب اس طرح ہونی چاہیئے تھی کہ (اس کا جلوہ وہ کفر سوز ہے) پروفیسر حامد حسن قادری نے اس میں یہ اصلاح دی ہے۔ (اس کا وہ کفر شکن جلوہ ہے جس سے ٹوٹے) یہ مصرعہ غالب کے مصرعہ سے اچھا ہے۔ لیکن طباطبائی کی اصطلاح ان سے بھی بہتر ہے انھوں نے (ٹوٹے) کی جگہ (اڑ جائے) لگایا ہے جو اردو کا خاص محاورہ ہے لیکن ان دونوں صاحبوں نے یہ غور نہیں فرمایا کہ ان کی اس اصلاح سے مصرعۂ اول تو درست ہو گیا مگر مصرعۂ ثانی کے (رونق ٹوٹنے) کی کچھ اصلاح نہیں ہوئی۔ اس شعر کی اس کے سوا کوئی اصلاح نہیں ہو سکتی کہ اسے مہملات کی مد میں داخل کر دیا جائے۔

(۳۱) دیر نہیں حرم نہیں در نہیں آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہ گذر پہ ہم غیر ہمیں اٹھائے کیوں

اچھا مضمون اور اچھا شعر تھا لیکن لفظ (غیر) نے اس کو پایۂ تکمیل سے گرا دیا کیونکہ غیر در سے اٹھا سکتا ہے آستاں سے اٹھا سکتا ہے محفل سے اٹھا سکتا ہے۔ دیر و حرم سے اس کا کچھ تعلق نہیں۔ دیر و حرم سے

برہمن، مغ، مغ بچہ، ساقی، محتسب، زاہد، واعظ، قاضی، شیخ اٹھا سکتے ہیں رہ گزر سے ہم آہنگ یا عکس اٹھا سکتا ہے، غیر یعنی رقیب کا ان مقامات سے کوئی واسطہ نہیں۔

(۳۲) کہیں نظر نہ لگے اُن کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

اس شعر کے متعلق مجموعہ استفسارات جلد سوم میں نیاز فتحپوری لکھتے ہیں۔

"مشہور و مقبول شعر ہے لیکن بعض نقادانِ فن کو اس پر یہ اعتراض ہے کہ پہلے مصرعہ میں دست و بازو کی تعیین مجبور کرتی ہے کہ زخمِ جگر کا مفہوم وہی نہیں جو حقیقتاً ایک زخم کا ہوا کرتا ہے زخمِ جگر کے الفاظ جو ہمیشہ بصورتِ مجاز و کنایہ استعمال کئے جاتے ہیں وہ یہاں نہیں آ سکتے اس لئے یہ غزل کی لطافت سے علیحدہ ہو کر فنونِ سپہ گری کی حد میں آ گیا۔ مومن نے اس ہی مضمون کو نہایت تکمیل و لطافت سے ادا کیا ہے۔

میرے تغیر رنگ کو مت دیکھ تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے

(۳۳) دھوتا ہوں میں جو پینے کو اس سیم تن کے پانوں
رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پانوں

یہ غزل عورتوں کے محاورے میں ہے اور اس کے اشعار میں ابتذال بھی ہے۔
آسی نے بھی یہی لکھا ہے۔

"اس[1] مضمون کو مصنف نے عورتوں کے محاورے سے نکالا ہے۔"

صاحب شعرالہند نے اس غزل میں ابتذال کی شکایت کی ہے

(۳۴) وہاں پہنچ کر جو غش آتا پے بہ ہم ہے ہم کو
صد رہ آہنگ زمیں بوس قدم ہے ہم کو

---

[1] تذکرہ معرکۂ سخن ۱۹۹ نگار بک ایجنسی ۳۲ء

(پئے ہم) یعنی (پیہم) اردو میں اس کا استعمال جیسا کہ اس شعر میں ہے غلط ہے ایسی غلطی کم علم، ناواقفِ فن، نوآموز شاعر سے ہو سکتی ہے شناخر بھی ہے پیہم بذوق نے باندھا ہے۔

کھائے پیہم یہ ترے ناوکِ مژگاں دل میں
اتنے مو تن پہ نہیں جتنے ہیں پیکاں دل میں

(۳۵) جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا
وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیوں کر ہو

محاورہ یہ ہے کہ دن کو رات کہے، مرزا یہی کہنا چاہتے تھے مگر کہہ نہ سکے الٹا کہہ گئے شارحین نے بھی صحیح محاورہ لکھ کر شرح کی ہے دکیوں کر ہو) بھی یہاں صحیح نہیں مطلب یہ ہے کہ وہ شخص دن کو رات نہ کہے تو کیا کہے یا کیا کرے میرے نزدیک کیوں کر ہو پر جو اعتراض ہے وہ صحیح ہے دوسرا اعتراض جو غلطی محاورہ کا ہے وہ صحیح نہیں، شارحین نے جو صحیح محاورہ لکھ کر شرح کی ہے وہ بھی غلط ہے کیوں کہ مرزا کا مقصد یہاں اس محاورہ سے نہیں ان کا مطلب یہ ہے کہ میں ایسا سیاہ بخت ہوں کہ جسے ایسا روزِ سیاہ نصیب ہو گا اسے اپنے روزِ سیاہ کے مقابلہ پر رات بھی دن کی طرح روشن نظر آئے گی یعنی رات کی تاریکی بھی اس کے سامنے سیاہ نہ معلوم ہو گی۔ افسوس ہے کہ مرزا کے شارحین کے ذہنِ رسا نے اس معمولی سی بات تک رسائی نہ پائی اس لئے تصرف محاورہ کا اعتراض درست نہیں ہاں تصرف کے ساتھ التباس کی شکایت کی جا سکتی ہے۔

(۳۶) بچتے نہیں مواخذۂ روزِ حشر سے
قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو

مواخذہ کے معنی ہیں گرفت کرنا آغا محمد باقر نے اپنی شرح بیانِ غالب میں اس کا ترجمہ پکڑ دھکڑ کیا ہے، مواخذہ مجرم سے ہوتا ہے گواہ سے نہیں ہوتا۔ گواہ سے تو دریافتِ حال ہوتا ہے گواہ کے لئے مواخذہ کا لفظ مناسب نہیں۔

(۳۷) حاصل سے ہاتھ دھو بیٹھ اے آرزو خرامی
دل جوشِ گریہ میں ہے ڈوبی ہوئی اسامی

اسامی غلط ہے صحیح لفظ آسامی ہے اسامی بغیر مد جمع الجمع ہے اسم کی کیوں کہ اسماء اسم کی جمع ہے اور اسماء کی جمع اسامی ہے، اسامی جس معنی میں شعر میں استعمال ہوا ہے وہ جاہل بولتے ہیں جو غلط العوام ہے اس کا استعمال جائز نہیں۔

آغا محمد باقر نے بھی آسامی لکھ کر شرح کی ہے۔ اہلِ لغت[1] نے بھی آسامی لکھا ہے ظفر نے آسامی باندھا ہے۔

پڑتی ہر رہروِ الفت پہ نہیں اس کی نگاہ
ڈھونڈتا ہے کوئی آسامی وہ رہزن اونچی

(۳۸) بیٹھا ہے جو کہ سایۂ دیوارِ یار میں
فرماں روائے کشورِ ہندوستان ہے

اس ترکیب میں ہندوستان کے نون کا اعلان جائز نہیں کیوں کہ جو الفاظ فارسی ترکیب کے ساتھ استعمال کیے جاتے ہیں وہاں نون کا اظہار جائز نہیں ہوتا۔ اگرچہ یہ اہلِ زبان کے رواج کے خلاف ہے۔ لغو شعر ہے۔

(۳۹) میرے ہوتے ہیں کیا ہے رسوائی
اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی

(اے وہ) یہ لفظ رکیک ہے طباطبائی نے بھی یہ اعتراض کیا ہے مگر آغا محمد باقر لکھتے ہیں کہ یہ غالب کے دور کی زبان ہے لیکن کوئی مثال پیش نہیں کی۔
(دعوائے بے دلیل قبول خرد نہیں)

---

[1] فیض اللغات مطبوعہ لاہور ۱۹۳۶ء و مخزن الفوائد صفحہ ۱۱۴ مطبوعہ محبوب پریس حیدرآباد دکن ۱۳۲۷ھ و نور اللغات جلد اول مطبوعہ نیر پریس لکھنؤ ۱۹۲۴ء مصنفہ نور الحسن نیر۔

(۴۰) قاطعِ اعمار ہیں اکثر نجوم
وہ بلائے آسمانی اور ہے

(اعمار) (عمر) کی جمع ہے اردو میں نامانوس ہے فارسی میں بھی اس کا استعمال نظر سے نہیں گزرا اکثر اساتذہ نے (عمرہا) باندھا ہے مولانا روم فرماتے ہیں۔

عمرہا گر رفت گو رو باک نیست
تو بما اے آں کہ چوں تو پاک نیست

(۴۱) جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا
کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے

(کرید) مکروہ لفظ ہے۔ یہ مضمون قائم چاندپوری سے لیا ہے جو فرماتے ہیں

دل ڈھونڈنا سینے میں مرے بوالعجبی ہے
اک ڈھیر ہے یاں راکھ کا اور آگ دبی ہے

بعض ناقدوں نے اعتراض کرتے ہوئے کہا ہے کہ کیا معشوق مرغی کا بچہ تھا جو راکھ کریدتا تھا۔

(۴۲) نقشِ نازِ بتِ طناز بہ آغوشِ رقیب
پائے طاؤس پئے خامۂ مانی مانگے

ایک مصرعہ میں چار اضافتیں بیحد معیوب ہیں۔ مرزا صاحب کے اکثر اشعار میں ایسا ہے۔

یہ طوفان گاہ جوشِ اضطراب شام تنہائی
شعاعِ آفتابِ صبح محشر تارِ بستہ ہے

اردو میں اضافت خود ہی ثقل رکھتی ہے نہ کہ سات اضافتیں، متوالی تین اضافتوں سے زیادہ ہونا سخت عیب ہے۔ شمس العلماء اثر لکھتے ہیں۔

"اضافتوں کی وہ بھرمار ہے کہ بعض وقت جی گھبرا اٹھتا ہے کہ انہی اضافتوں کا سلسلہ کب ختم ہوگا۔"

(۴۴) جو مدعی بنے اُس کے نہ مدعی بنیئے
جو نا سزا کہے اس کو نہ نا سزا کہیئے

تنافر دو بار ہے۔

(۴۵) نہیں ذریعۂ راحت جراحتِ پیکاں
وہ زخمِ تیغ ہے جس کو کہ دل کشا کہیئے

(جس کو کہ) حشوِ قبیح ہے۔

(۴۶) بھون پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیئے
مسجد کے زیرِ سایہ خرابات چاہیئے

(بھون) یہ لفظ برا ہے حسرت اور آسی نے بھی یہی خیال ظاہر کیا ہے۔

(۴۷) طبع ہے مشتاقِ لذت ہائے حسرت کیا کروں
آرزو سے ہے شکستِ آرزو مطلب مجھے

مصرعۂ ثانی میں (مطلب) صحیح نہیں (مطلوب) ہونا چاہیئے محاورہ اس طرح ہے۔
(اس کو یہ مطلوب ہے) (اس کا یہ مطلب ہے) اور شعر میں (مجھے) کا لفظ (مجھ کو) کی جگہ ہے اس لئے (مطلب) کی جگہ (مطلوب) ہونا چاہیئے۔

(۴۸) قیامت ہے کہ ہوئے مدعی کا ہم سفر غالب
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

مصرعہ ثانی میں (نہ) کی جگہ (نہیں) ہونا چاہیئے یا (ہے) کو ترک کرنا چاہیئے۔ کیوں کہ (نہ) کے ساتھ فعل منفی میں (ہے) بولنا خلاف محاورہ ہے۔

(۴۹) کی ہم نفسوں نے اثرِ گریہ میں تقریر
اچھے رہے آپ اس سے مگر مجھ کو ڈبو آئے

مطلب یہ ہے کہ اکثر اثرِ گریہ میں کلام کیا اس مفہوم کے ادا کرنے کے لئے یہ کہنا غلط ہے کہ اثرِ گریہ میں تقریر کی اثرِ گریہ میں تقریر کرنے کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ اثرِ گریہ کو بیان کیا جو یہاں اس کا محل نہیں اور کلام کرنے کے موقعہ پر فارسی میں بھی در اثرِ گریہ

تقریر کرو) محاورہ نہیں ہے۔

(۵۰) اور میں وہ ہوں اگر جی میں کبھی غور کروں
غیر کیا خود مجھے نفرت مری اوقات سے ہے

(مجھے میری اوقات سے نفرت ہے) اس کے متعلق طبا طبائی نے کہا ہے کہ رہ رہ کر تعجب ہوتا ہے کہ غالب کی زبان سے یہ لفظ کیوں کر نکلا جن لوگوں کی اردو درست نہیں ہوتی ان کو ضرور اس طرح بولتے سنا ہے، میں عرض کرتا ہوں کہ مصرعۂ ثانی میں (سے) غلط ہے (ہو) ہونا چاہیئے تھا۔

(۵۱) ہم سے رنجِ بے تابی کس طرح اٹھایا جائے
داغِ پشتِ دستِ عجز شعلہ خس بہ دنداں ہے

اس شعر کی روانی میں نقص ہے۔ پنڈت کیفی نے بھی اپنی تصنیف کیفیہ کے ۲۴۹ پر اس شعر کے متعلق بھی شکایت کی ہے۔

(۵۲) رنج رہ کیوں نہ کھینچے واماندگی کو عشق ہے
اٹھ نہیں سکتا ہمارا جو قدم منزل میں ہے

اس شعر کے متعلق پروفیسر حامد حسن نے لکھا ہے۔

"یہ شعر[1] غالب کے ضعفِ نظم اور ناتمامیٔ بندش کی متعدد مثالوں میں سے ایک مثال ہے:"

(۵۳) دیوار بارِ منتِ مزدور سے ہے خم
اے خانماں خراب نہ احساں اٹھائیے

دیوار میں خم دو طرح پر ہوتا ہے ایک طول میں یہ یا تو تنگیٔ زمین کی وجہ سے ہوتا ہے یا مالکِ مکان کی کسی مصلحت سے اس سے مزدور کا کچھ واسطہ نہیں۔ دوسرا خم اونچائی میں ہوتا ہے یہ امتدادِ زماں یا کسی صدمہ سے ہوتا ہے اس کا بھی مزدور سے کچھ

---

[1] نقد و نظر ص۳۲

تعلق نہیں اور یہ خم کبھی کسی دیوار میں ہو جاتا ہے اس لئے اس کو کلیہ کے طور پر عمومیت کے ساتھ بیان کرنا غلط ہے۔

مرزا صاحب یہ فرمانا چاہتے تھے کہ احسان کا بوجھ بہت بھاری ہے اس کو نہ اٹھانا چاہیئے اور اس مطلب کو تمثیل سے ثابت کرنا چاہتے تھے لیکن نہ صحیح تمثیل لا سکے نہ مضمون کو صحت سے ادا کر سکے۔

(۵۴) رہے نہ جان تو قاتل کو خوں بہا دیجے
کٹے زبان تو خنجر کو مرحبا کہیئے

اس شعر کے متعلق نیاز فتحپوری لکھتے ہیں

"غالب[۵۱] نے اس شعر میں صرف (خوں بہا دیجے) نے ذرا پیچیدگی پیدا کر دی ہے ورنہ مطلب بالکل صاف تھا۔ اس کے متعلق بعض کا خیال ہے کہ خوں بہا دینے سے مراد خوں بہا معاف کر دینا ہے اور یہی بظاہر صحیح معلوم ہوتا ہے کیوں کہ دوسری صورت میں بہت تاویلِ بعید سے کام لے کر مفہوم پیدا کرنا پڑے گا۔"

آغا محمد باقر صاحب نے اس کی شرح میں آسی صاحب کی شرح سے یہ مطلب نقل کیا ہے۔

"خوں[۵۲] بہا — فدیہ — وہ قیمت جو خون کے بدلے ادا کی جاتی ہے اگر جان پاس نہ ہو اور وہ جاتی رہے تو پھر قاتل کو اس کا خون بہا ادا کیجئے کہ جان نہیں دے سکتے تو یہ حاضر ہے اور اگر زبان کٹ جائے تو خنجر کو مرحبا آفریں کہئے۔"

اس شرح کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔

---

[۵۱] مجموعہ استفسارات حصہ اول مطبوعہ بار اول ۱۹۳۴ء [۵۲] بیانِ غالب مصنفہ آغا محمد باقر ایم اے۔ ایم او ایل مطبوعہ عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور ۱۹۴۰ء

"باقی شارحین پہلے مصرعہ کی یہ شرح بیان کرتے ہیں۔ اگر جان جاتی رہی تو قاتل کو بخش دیجئے"۔

نیاز صاحب نے جو شرح کی ہے اس میں یہ قباحت لازم آتی ہے کہ (خوں بہا ادا کرنا) بجائے (خوں بہا معاف کر دینا) کی ہے۔ یہ مراد بالکل بے تک بات ہے (ادا کرنا) اور (چھوڑنا یا بخش دینا) کیا ایک ہی بات ہے کیا اس طرح مراد لینے کی کوئی مثال موجود ہے۔

اگر شاعر کا یہی مطلب تھا تو بقول مرزا یگانہ کہنا پڑے گا کہ شاعر ادائے مطلب پر قادر ہونے کی قابلیت نہیں رکھتا۔

اور اگر آسی صاحب والا مطلب لیا جائے تو یہ قباحت پیدا ہوتی ہے کہ (خوں بہا) خون کر دینے کے بعد واجب ہوتا ہے اور (خون بہا) اُس رقم کو کہتے ہیں جو قاتل مقتول کے ورثاء کو ادا کرتا ہے جب جان پاس تھی ہی نہیں اور خون ہوا ہی نہیں تو خون بہا کیسا اور کوئی موزوں لفظ لانا تھا۔ علاوہ بریں قاتل کو خون بہا دینے کا کیا مطلب۔

غالب کے شارحوں کی معلومات اور علمیت کی کہاں تک تعریف کی جائے (خوں بہا) کا ترجمہ (فدیہ) کرتے ہیں ان کو (فدیہ) اور (خوں بہا) کا فرق معلوم نہیں (خون بہا) کے لئے عربی میں لفظ (دیت) ہے یعنی وہ رقم یا چیز جو مقتول کی جان کے معاوضہ میں اُس کے ورثاء کو ادا کی جائے (فدیہ) اسیروں قیدیوں کا ہوتا ہے جو زندہ ہوتے ہیں فارسی میں اس کو (سر بہا) کہتے ہیں۔

جو مطلب نیاز صاحب اور آسی صاحب اور آغا صاحب نے لکھا ہے اگر وہی مطلب اس شعر کا ہے تو کسی صاحبِ نظر کو یہ کہنے میں تامل نہ ہوگا کہ شعر مہمل ہے اور ان میں سے کوئی مطلب صحیح طور پر چسپاں نہیں ہوتا۔

میرے خیال میں ایک مطلب اس شعر کا ہو سکتا ہے لیکن اس مطلب کے بعد بھی کہنا ہی پڑے گا کہ شاعر ادائے مفہوم پر قادر نہ ہو سکا۔۔ مطلب یہ ہے کہ عاشق کی جان کا مالک معشوق ہوتا ہے عاشق کو اپنی جان پر کوئی حق و اختیار

باقی نہیں رہتا۔ شاعر کہتا ہے کہ ہم نے درد و غم میں جان کھودی۔ ہمیں جان کے ضائع کرنے کا کوئی حق نہ تھا یہ تو معشوق کی چیز تھی اس کو اختیار تھا اس لئے ہم پر خون بہا واجب ہوگیا۔

(۵۹) شبنم بہ گل ولالہ نہ خالی ز ادہ ہے
داغ دل بے درد و نظر گاہِ حیا ہے

اس شعر میں (نہ) غلط ہے (نہیں) ہونا چاہیئے۔

(۶۰) آمدِ سیلاب طوفانِ صدائے آب ہے
نقشِ پا جو کان میں رکھتا ہے انگلی جادہ سے

یہ شعر مہمل ہے اور اگر اس کے کچھ معنی لگائے جائیں تو (جادہ) کا لانا یہاں غلط ہے (جادے) آنا چاہیئے۔ آغا محمد باقر صاحب لکھتے ہیں۔

کہ نقشِ پا کی صورت کان سے اور
جادہ کی انگلی سے مشابہت ہے

واہ واہ کیا کہنا ہے کیسی عمدہ تشبیہہ نکالی ہے اور کیا عجیب و غریب نکتہ پیدا کیا ہے۔

(۶۱) دل مدعی و دیدہ بنا مدعا علیہ
نظارہ کا مقدمہ پھر روبکار ہے

پہلے مصرعہ کی نثر یوں ہوگی (دل مدعی بنا اور دیدہ مدعا علیہ بنا) دو اردو جملوں میں (اور) کی جگہ (واؤ) حرفِ عطف غلط ہے۔ مرزا صاحب کے چند اور اشعار میں بھی یہ عیب ہے۔

(۶۲) حالانکہ ہے یہ سیلیٔ خارا سے لالہ رنگ
غافل کو میرے شیشے پہ مے کا گمان ہے

اس کا یہ مطلب بیان کیا گیا ہے کہ میرا شیشہ پتھر کی ضرب سے سرخ ہو رہا ہے غافل یہ سمجھتا ہے کہ اس میں شرابِ سرخ بھری ہوئی ہے۔ طباطبائی نے

یہ اعتراض کیا ہے کہ پتھر کی چوٹ سے شیشہ ٹوٹ جاتا ہے لالہ رنگ نہیں ہوتا آغا باقر لکھتے ہیں قیاس یہ کہتا ہے کہ مصنف نے شیشے سے دل کا استعارہ لے کر اس کو لالہ رنگ کہا ہے ایسے استعارے اور ایسے قیاس شاعری میں مضحکہ انگیز ہوتے ہیں۔

(۶۳) خستگی کا تم سے کیا شکوہ کہ یہ
ہتھکنڈے ہیں چرخ نیلی فام کے

(فام) بھرتی کا لفظ ہے اس کو معنی میں دخل نہیں۔

(۶۴) پا بدامن ہو رہا ہوں بسکہ میں صحرا نورد
خار پا ہیں جوہر آئینۂ زانو مجھے

یہ شعر مہمل ہے اس کے متعلق شمس العلماء پروفیسر مولانا عبدالرحمٰن دہلوی لکھتے ہیں۔

"معنی کچھ بھی نہیں دوسرے مصرعہ سے صحرانوردی میں پا بدامن ہونے کا ثبوت دیا ہے جو بظاہر محال ہے"[۱]

(۶۵) اللہ رے تیری تندئ خو جس کی بیم سے
اجزائے نالہ دل میں مرے رزقِ ہم ہوئے

معنی ایک حقیقت رکھتے ہیں اور تاثیر کی قابلیت بھی لیکن (تندئ خو) اور (رزقِ ہم) نے شعر کے تمام حسن اور حسنِ تاثیر کو برباد کر دیا۔ اس شعر کے متعلق یہی رائے شمس العلماء مولانا عبدالرحمٰن نے مرأۃ الشعر صہ ۲۹۳ پر ظاہر کی ہے۔

(۶۶) جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو
روزہ اگر نہ کھائے تو ناچار کیا کرے

---

[۱] مرأۃ الشعر صہ ۲۹۲

مضاف مضاف الیہ کے درمیان سے حرفِ اضافت کا حذف جائز نہیں یعنی (جس کے پاس) ہونا چاہیئے۔

(۶۷) تو سکندر ہے مرا فخر ہے ملنا تیرا
گو شرفِ خضر کی بھی مجھ کو ملاقات سے ہے

شعر میں تعقید ہے۔

(۶۸) آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں
سوزِ غمہائے نہانی اور ہے

معشوق کی محبت کے غم یعنی غمِ نہانی کا دوزخ کی آگ سے موازنہ کیا ہے، اس سے عشق اور معشوق دونوں کی مذمت نکلتی ہے ایسے مقام پر ایسا لفظ استعمال کرنا کہ جس سے ذم کا پہلو نکلتا ہو سخت معیوب ہے آتشِ حسد کا آتشِ دوزخ سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے عاشق کے غمِ نہانی کے سوز کا موازنہ آتشِ دوزخ سے کرنا صحیح نہیں کتاب نشورات میں یہ اعتراض کیفی دہلوی نے بھی پیش کیا ہے۔

(۶۹) بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی
سو رہتا ہے باندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی

اندازِ چکیدن غلط ہے اضافت کے ساتھ اردو میں بجائے حاصل مصدر کے خود مصدر کا لانا درست نہیں۔ شتر گربگی ان کی غزلوں اور قصیدوں میں بہت ہے ایک ہی قصیدے میں تم کا لفظ لاتے ہیں اور اسی میں آپ کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔

تم نے مجھ کو جو آبرو بخشی ہوئی میری وہ گرمیِ بازار
آپ کا بندہ اور پھروں ننگا آپ کا نوکر اور کھاؤں ادھار

مرزا داغ اپنے ایک منظوم خط میں لکھتے ہیں۔

اک جگہ پر تو ہو تم دوسری جا پر تو ہو
یہ شتر گربہ ہوا میں نے اسے ترک کیا

اگر غالب کے ایسے تمام اشعار ہٹے جائیں جن میں ختر گربگی، تعقید، تنا فر وغیرہ عیوب ہیں تو ان ستر اشعار پر سیکڑوں کا اور اضافہ ہو جائے گا۔

پروفیسر حامد حسن قادری لکھتے ہیں۔

"حقیقت[1] یہ ہے کہ غالب نے وہ سب غلطیاں کی ہیں جو شاعری میں ہو سکتی ہیں اور شاعر سے نہیں ہونی چاہئیں"

سید علی حیدر نظم طبا طبائی لکھنوی المخاطب بہ حیدر یار جنگ نے اپنی شرح میں مرزا غالب کی اس قسم کی اور بھی بہت سی غلطیاں دکھائی ہیں جن کا کچھ جواب نہیں ہو سکتا طبا طبائی کے اعتراضات کے متعلق[2] مولانا حسرت موہانی نے یہ رائے ظاہر کی ہے۔ رسالہ الاصلاح اعظم گڑھ میں ایک اہلِ قلم نے لکھا ہے۔

"ہم[3] نہیں کہتے کہ غالب کا کلام ابتذال یا دوسرے عیوب سے پاک ہے بلا شبہ ان کے کلام میں عیوب ہیں"

پروفیسر کلیم الدین لکھتے ہیں۔

"غالب[4] کے کلام میں چند مخصوص نقائص بھی ہیں"

پروفیسر شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد دہلوی لکھتے ہیں۔

"اکثر[5] الفاظ اس طرح ترکیب دیئے جاتے تھے کہ بول چال میں اس طرح نہیں بولتے"

ڈاکٹر قاضی عبد الرحمٰن سیوہاروی بجنوری مرحوم لکھتے ہیں۔

"مرزا[6] غالب نے بعض اوقات قواعد کے خلاف زبان لکھی ہے سید فضل الحسن حسرت اور علی حیدر طبا طبائی نے نہایت معقول

---

[1] نقد و نظر صد ۱۳ [2] شرح دیوانِ غالب حسرت موہانی [3] اکتوبر ۱۹۳۹ء

[4] اردو شاعری پر ایک نظر صد ۱۶۶ [5] آبِ حیات ذکرِ غالب [6] محاسنِ کلام غالب صد ۱۲ مطبوعہ ۱۹۲۵ء۔

اعتراضات کیئے ہیں۔

شارح دیوانِ غالب جناب احسان بن دانش لکھتے ہیں۔

"ان[1] کے دیوان میں ایسے اشعار بھی موجود ہیں جن میں مذاق صحیح اور زبان صحیح دونوں کی طرف سے اعتراضات کے علاوہ نقائص بھی موجود ہیں"

اپنی شرح میں احسان صاحب نے مرزا غالب کے کلام میں تنافرِ تکرار، الفاظِ قبیح، تعقیدِ لفظی، نقصِ روانی وغیرہ عیوب کو تسلیم کیا ہے میرا اندازہ ہے کہ مرزا غالب کے دو ہزار اشعار میں سے ایک ہزار سے زیادہ ایسے اشعار ہیں جن میں نقائص و عیوب موجود ہیں۔ اس قسم کی مثال مشہور اساتذہ کے کلام میں تو کیا غیر معروف شعرائے کے کلام میں بھی ملنی مشکل ہے۔

معذرت

مرزا غالب کے اغلاط کے جواب میں دو عذر پیش کیئے جاتے ہیں ایک یہ کہ قواعدِ عروض و صرف و نحو وغیرہ مانع ترقی ہیں ان کی پرواہ نہیں کرنی چاہیئے ظاہر ہے کہ یہ قول ایسے لوگوں کا ہو سکتا ہے جن کو علم و فن سے تعلق نہ ہوگا اور جو اردو شاعری اور اردو زبان اور ان کی تاریخ سے ناواقف ہوں گے اور جن کو عقلِ سلیم سے بھی کم حصہ ملا ہوگا اس عذر کے جواب میں اول ہی بہت کچھ لکھ آیا ہوں۔

دوسرے یہ کہا جاتا ہے کہ مرزا صاحب نے تصرف کیا ہے جن لوگوں کا یہ قول ہے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تصرف کی حقیقت سے آگاہ نہیں ہیں تصرف ہر شاعر کا حق نہیں ہے تصرف اہلِ زبان اور ایسے قادر الکلام ماہرانِ فن

---

[1] رموزِ غالب صہ ۲۷

کر سکتے ہیں کہ جن کا کلام اغلاط و اسقام سے پاک ہو پُرگو اور مشاق ہوں لیکن قواعد و محاورات پر کسی کا بھی تصرف نہیں چلتا وہ اساتذہ جو تصرف کا حق رکھتے ہیں الفاظ کو بہ کمی بیشیٔ حروف یا بہ تبدیلِ حرکات یا بہ تغیر معنی استعمال کر سکتے ہیں اور یہ غیر زبان کے لفظ کو اُس کی اصلی اور صحیح صورت میں بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ یہ عمل وہی اہلِ زبان کر سکتے ہیں جنھوں نے کامیابی کے ساتھ اصنافِ سخن پر زورِ طبع صرف کیا ہو ان کے کلام کی مقدار بھی کافی ہو اور سب سے بڑی بات، یہ کہ ان کا کلام اغلاط و اسقام سے پاک ہو لیکن ایسے اساتذہ کا بھی ہر تصرف قابلِ قبول نہیں اور اعتراض سے بری بھی نہیں۔ اردو شاعری اور اساتذہ کے کلام پر نظر کرنے سے تین قسم کے تصرفات ثابت ہوتے ہیں۔ ایک تصرف محمود یعنی ایسا تصرف جو لائقِ تقلید اور مستحسن ہے جس سے نہ لفظ کی صورت بگڑے نہ خلافِ قواعد ہو جائے۔ ثقیل نہ ہو جائے بلکہ خوبصورت، سبک اور شیریں رہے جیسے سید انشاء نے اطالوی لفظ (کیمرا) پر تصرف کر کے (کمرہ) بنا لیا جو اصل لفظ سے سبک اور خوبصورت رہا فرماتے ہیں۔

نکہت آوے گی نکل کھول کلی کا کمرہ
ساتھ ہووے گی نزاکت بھی جو ہے اُس کی بہن

دوسرے تصرفِ مخصوص یعنی کسی استاد نے کہیں سخت مجبوری سے کسی لفظ میں تصرف کر لیا اور وہ لفظ خوبصورت اور سبک نہ رہا بلکہ بھدا ہو گیا جیسے صحیح انگریزی لفظ (گلاس) ہے سبک اور خوبصورت ہے۔ سید انشاء نے تصرف کر کے (گیلاس) باندھا ہے۔ فرماتے ہیں۔

اپنے گیلاس شگوفے بھی کریں گے حاضر
آ کے جب غنچۂ دل کھولیں گے بزم کھیرن

(گیلاس) خوبصورت اور سبک نہیں رہا لیکن اس کے سوا چارہ کار نہ تھا۔ ایسے تصرف پر اعتراض تو نہیں کیا جاتا مگر تقلید بھی نہیں کی جاتی۔

تیسرے تصرفِ مذموم یعنی تغیر کے بعد لفظ متین، خوبصورت اور سبک نہ رہے یا قواعد کے خلاف ہوجائے یا غلط العوام میں مل جائے ایسا تصرف جائز نہیں اور وہ ثق اعتراض ہے جیسے شاہ حاتم نے صیح لفظ (اکیلا) کو مصرعہ ملانے کے لئے (ایکلا) باندھا ہے فرماتے ہیں۔

کئی عالم کئے ہیں قتل اُن نے
کرے کیا ایکلا حاتم بچارا

(ایکلا) غلط العوام ہے جاہل بولتے ہیں۔

مرزا غالب کے یہاں نہ تمام اصنافِ سخن ہیں نہ اُن کا کلام کچھ زیادہ مقدار میں ہے اُن کے کلام میں اس قدر اغلاط و اسقام ہیں جو کسی اوسط درجے کے شاعر کے کلام میں بھی نہیں ہونے چاہئیں۔ ایسی صورت میں اُن کو مجتہد و متصرف نہیں مانا جاسکتا۔ اُن کی ہر غلطی قابلِ گرفت ہوگی۔

اغلاط کے وجوہ

کلام میں غلطیاں تین وجہ سے ہوتی ہیں۔

ایک یہ کہ شاعر کم علم، کج فہم اور کم مشق ہو۔ دوسرے یہ کہ شاعر بے پرواہو تیسرے یہ کہ زبان پر اس کو قدرت حاصل نہ ہو۔ پہلی وجہ کو مرزا غالب کے اغلاط کا سبب قرار دینا حق وانصاف کا خون کرنا ہے۔ وہ ذی علم زکی اور طباع تھے ساٹھ برس تک مشقِ سخن کرتے رہے ان کی غلطیوں کا سبب دوسری اور تیسری وجوہ ہیں۔ وہ نازک خیالی میں ایسے محو تھے کہ اور سب طرف سے بے خبر اور بے پروا تھے۔ انھوں نے کسی استاد کامل کے سامنے زانوئے تلمذ بھی طے نہیں کیا تھا بہت کم ایسی طبائع سلیم ہوتی ہیں جو بغیر راہبر کے راہ یاب ہوجاتی ہیں ان تمام امور کے علاوہ انھیں اردو زبان پر ایسی قدرت بھی حاصل نہ تھی کہ نظم میں کما حقہ اظہار ما فی الضمیر کرسکیں۔

ثقیل و نامانوس الفاظ

ان کے کلام میں غریب و ثقیل الفاظ کی بھی کثرت ہے مثلاً

دہانِ ہر بتِ پیغارہ جو زنجیرِ رسوائی ... عدم تک بیوفا چرچا ہے تیری بیوفائی کا

افسوس کہ دیداں کا کیا رزق فلک نے ... جن لوگوں کی تھی درخورِ عقدِ گہر انگشت

نہ لیوے گر خسِ جوہر طراوت سبزۂ خط سے ... لگاوے خانۂ آئینہ میں روئے نگار آتش

عجز سے اپنے یہ جانا کہ وہ بدخو ہوگا ... نبضِ خس سے تپش شعلۂ سوزاں سمجھا

الفاظ تحت خط کو اس زمانے کے منشی فاضل اور مولوی فاضل بھی بغیر ضخیم لغات کی مدد کے حل نہیں کر سکتے۔

اسدؔ ہم وہ جنوں جولاں گدائے بے سروپا ہیں
کہ ہے سر پنجۂ مژگانِ آہو پشت خار اپنا

ایسے ایسے چھ اشعار لکھ کر حسرت موہانی نے اپنی شرح میں نوٹ لکھا ہے کہ الفاظ ثقیل و غریب ہیں۔

کوہ کندن و کاہ برآوردن

شمارِ سبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا
تماشائے بیک کف بردن صد دل پسند آیا

آسی نے اپنی شرح میں اس شعر کے متعلق لکھا ہے۔

"ایسے مضمون کو کوہ کندن وکاہ برآوردن سے زیادہ وقعت نہیں دی جا سکتی۔

اس قسم کی اور بھی مثالیں دیوانِ غالب میں موجود ہیں۔

خراب ترکیبیں

اردو کے شعراء ہمیشہ فارسی ترکیبوں کو استعمال کرتے رہے ہیں۔ غالب کے دور میں تقریباً تمام اساتذہ نے کثرت سے فارسی تراکیب کا استعمال کیا ہے۔ مرزا غالب نے جو فارسی ترکیبیں استعمال کی ہیں ان میں بعض بہت اچھی ہیں اور بعض خراب ترکیبیں ہیں۔ مثلاً

نشہ ہا شاداب، رنگِ ساز ہا مستِ طرب
شیشۂ مے سروِ سبزِ جوئبارِ نغمہ ہے

عرضِ نازِ شوخیٔ دنداں برائے خندہ ہے
دعوئ جمعیتِ احباب جائے خندہ ہے

نالہ سرمایۂ یکِ عالم و عالم کفِ خاک
آسمان بیضۂ قمری نظر آتا ہے مجھے

ان ترکیبوں کے متعلق نیاز فتحپوری لکھتے ہیں۔

"ان میں[1] کوئی فارسی ترکیب ایسی نہیں جسے دل نشین کہہ سکیں نہ نشستِ الفاظ کے لحاظ سے نہ خوبیٔ فہم کی حیثیت سے"

مسٹر ارتضا حسین لکھتے ہیں۔

"جہاں[2] نہایت غیر مانوس قسم کی فارسی ترکیبیں استعمال کی گئی ہیں وہاں صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر کا ذہن ابھی اس درجے تک نہیں پہنچا کہ اپنی فیتسی کو زیادہ ٹھوس بنا سکے نیز یہ کہ ابھی اسے اپنے بیان پر پوری قدرت حاصل نہیں ہوئی"

---

[1] مجموعۂ استفسارات جلد سوم ص ۲۰۳
[2] نگار اپریل ۱۹۴۵ء

سوقیانہ پن

درحقیقت اردو عاشقانہ شاعری میں معاملہ بندی کے مضامین نہایت لطف افزا ہوتے ہیں۔ معاملہ بندی کو اردو شاعری میں امیر خسروؒ نے داخل کیا اور ان کے بعد تمام شعراء اس پر زورِ طبع صرف کرتے رہے یہ شاعری کا ایسا نازک مرحلہ ہے کہ اسے ذی علم، قادر کلام، ماہرِ زبان و فن استاد ہی خوبی کے ساتھ طے کر سکتا ہے کیونکہ اس میں خفیف سی لغزش بھی کلام کو متانت سے گرا دیتی ہے معاملہ بندی میں جراُت زیادہ مشہور ہیں مگر ملکی افلاس کی وجہ سے ان کی معاملہ بندی سوقیت بن گئی ہے لیکن ان کے اس قسم کے کلام میں بھی ایک قسم کا لطف رندانہ طبائع کے لئے موجود ہے، مرزا غالب جب اس رنگ پر آئے تو ان کے کلام میں نہایت بھدی اور بے مزہ سوقیت پیدا ہو گئی۔

صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو
دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کئے

غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں
بوسے کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں

مبتذل تشبیہات

دہانِ ہر بتِ پیغارہ جوں زنجیرِ رسوائی
عدم تک بے وفا چرچا ہے تیری بے وفائی کا

معشوق کے منہ کو زنجیر سے تشبیہ دی ہے جو نہایت ناموزوں اور نامعقول ہے چکنی ڈلی کی تعریف میں فرماتے ہیں۔

خاتمِ دستِ سلیماں کے مشابہ لکھئے
سرِ پستانِ پری زادہ سے مانا کہئے

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسد
ڈرتا ہوں آئینہ سے کہ مردم گزیدہ ہوں

پروفیسر قادری نے لکھا ہے۔
"غیر مقبول تشبیہیں پیدا کرتے ہیں"[1]
افسوس ہے کہ حالی نے مرزا غالب کے متعلق لکھا ہے۔
"وہ عام اور مبتذل تشبیہوں کو استعمال نہیں کرتے"[2]
کیا اس سے زیادہ کوئی مبتذل تشبیہ ہو سکتی ہے آگے فحش کا میدان ہے۔
شیخ محمد اکرم لکھتے ہیں۔
"لیکن بعد کی تشبیہات اس طرح شاعرانہ حسن یا موزونیت سے عاری نہیں"[3]
اس قول سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ابتداء کی تشبیہات ضرور ناقص و مبتذل ہیں۔ مرزا غالب کے مداحوں نے مرزا صاحب کی جدید تشبیہات میں ان تشبیہات کو بھی شامل کر دیا ہے جنھیں مرزا سے پہلے اساتذہ پیدا کر چکے تھے۔
"ایک صاحب نے لکھا ہے کہ موجِ نفس، موجِ سراب"
یہ تشبیہیں مرزا صاحب نے پیدا کی ہیں۔ حکیم عبدالحی نے گلِ رعنا میں مرزا صاحب کے ذکر میں لکھا ہے کہ سانس کی تشبیہ موج سے مرزا کی پیدا کردہ تشبیہ ہے حالانکہ یہ دونوں تشبیہیں مرزا صاحب سے کم و بیش ایک صدی قبل قائم چاندپوری نے پیدا کی ہیں۔ فرماتے ہیں۔

جو دیکھتے ہو اس میں خیالات و خواب ہے
دنیا بھی اک نمونۂ موجِ سراب ہے

موجِ نفس سے ناداں غافل نہ ہو کہ تیری
یہ ہستیِ دو روزہ موجِ کنارِ جُو ہے

---

[1] نقد و نظر ص ۵۲ [2] رسالہ اردو اپریل ۱۹۲۲ء ص ۵۶ [3] آثارِ غالب ص ۱۹۱

رعایتِ لفظی

رعایتِ لفظی شعر کا زیور ہے لیکن اس طرح چاہیئے کہ کسی کو نہ کھٹکے مرزا غالب کے اشعار میں بھی یہ صنعت ہے لیکن اکثر موقعوں پر ان کے کلام میں رعایتِ لفظی کھٹکتی ہے جو ایک عیب ہے ۔ مولوی عبدالسلام ندوی لکھتے ہیں[1]

"بعض جگہ تو اس صنعت کو کسی قدر بھدے طریقے سے برتا ہے"

بیاں کیا کیجئے بیدادِ کاوش ہائے مژگاں کا
کہ ہر اک قطرۂ خوں دانہ ہے تسبیحِ مرجاں کا

کاوش کی رعایت میں دوسرے مصرعہ کو بالکل بے معنی کر دیا قطرۂ خوں میں کاوشِ مژگاں سے سوراخ ہو جانا اور اس کا رشتۂ تسبیح میں پروئے ہوئے دانۂ مرجاں کی صورت اختیار کر لینا کوئی معنی نہیں رکھتا ۔

سبزۂ خط سے ترا کاکلِ سرکش نہ دبا
یہ زمرد بھی حریفِ دمِ افعی نہ ہوا

سبزۂ خط معشوق کے چہرے پر خط کا آغاز ۔۔۔ زمرد کا سبز رنگ ہوتا ہے سانپ اس کو دیکھ کر اندھا ہو جاتا ہے مطلب یہ ہے کہ تیرا زمردیں سبزۂ خط افعی زلف پر کچھ اثر انداز نہیں ہوا یعنی خط آنے کے بعد حسن کی دل کشی جاتی رہنی چاہیئے تھی لیکن ایسا نہیں ہوا ۔

آتش پرست کہتے ہیں اہلِ جہاں مجھے
سرگرمِ نالہ ہائے شرربار دیکھ کر

دل مدعی و دیدہ بنا مدعا علیہ
نظارے کا مقدمہ پھر روبکار ہے

چشمِ ماروشن کہ اس بیدرد کا دل شاد ہے
دیدۂ پرخوں ہمارا ساغرِ سرشارِ دوست

[1] شعرالہند

اور اس قسم کی بہت سی مثالیں ہیں۔

تغزل

اکثر غزلوں کی زبان نامانوس ہے اکثر الفاظ و تراکیب ثقیل ہیں صرف و نحو، عروض و لغات کی اغلاط بھی بہت ہیں کچھ اشعار اور غزلیں ایسی ہیں جن کو صحیح اور بہتر کہا جا سکتا ہے۔ خیالات نازک ہیں اکثر تشبیہات و استعارات نفیس ہیں تغزل کا رنگ خوب ہے۔ درد اور میر کے بعد سوز و گداز ان کا حصہ ہے مہمل شعر بھی جاہل نافہم کے کلیجے کے پار نکل جاتا ہے مگر جو صاف، سادہ، عمدہ اور صحیح اشعار ہیں ان میں درد و خستگی نازک خیالی بہ نسبت دیگر قسم کے اشعار کے کم ہے کچھ غزلیں ایسی بھی ہیں جن میں تغزل کا رنگ نہیں۔ شمس العلماء نواب امداد امام اثر لکھتے ہیں۔

"حضرت غالب[لہ] کے کچھ وہ اشعار جن سے مذاقِ غزلیت نہیں اٹھے گا نمونے کے طور پر ذیل میں عرض کئے جاتے ہیں۔

شمارِ سبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا
تماشائے بیک کف بردنِ صد دل پسند آیا

بہ فیضِ نذرِ کرم تحفہ ہے شرمِ نارسائی کا
بخوں غلطیدنِ صد رنگ دعویٰ پارسائی کا

یہ دونوں غزلیں اور اسی طرح اور بھی چند غزلیں لطفِ غزلیت سے خالی ہیں۔

بگرمِ فریاد رکھا شکلِ نہالی نے مجھے
تب اماں ہجر میں دی بردِ لیالی نے مجھے

لہ کاشف الحقائق جلد دوم ص۱۳۵

کارگاہِ ہستی میں لالہ داغ ساماں ہے
برقِ خرمن راحت خونِ گرم دہقاں ہے

ان دونوں غزلوں کے متعلق نیاز فتحپوری لکھتے ہیں کہ تغزل سے خارج ہیں۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

اس کو بھی تغزل سے خارج قرار دیا ہے اور لکھتے ہیں۔

"غالب کا اردو کلام بہت تھوڑا ہے اس میں بھی صحیح تغزل چوتھائی حصہ سے زیادہ نہیں"

غزل کے مضامین معشوق کے داخلی و خارجی اوصاف کا بیان واعظ و زاہد سے چھیڑ چھاڑ موعظت و اخلاق میں مرزا غالب بہت پھیکے ہیں یاس و حرمان نائے و نوش مصائب و آلام ہجر و فراق کے مضامین کو خوب ادا کیا ہے پروفیسر رشید احمد لکھتے ہیں۔

"غالب کی شاعری ایک حد تک ہائے ہو اور نائے و نوش کی ترجمان ہے"

پروفیسر حامد حسن قادری لکھتے ہیں۔

"غالب گنہگاروں کے شاعر ہیں"

ڈاکٹر زور لکھتے ہیں۔

"فراق کی مصیبتیں وصل کی امیدیں معشوق کا غرور اور بے پروائی عاشق کی عاجزی اور بے کسی اغیار کے طعن و تشنیع، قاصدوں کی خوشامد معشوق کے خط و خال کی تعریف اپنے عشق کی زیادتی کا

۱؎ مجموعہ استفسارات جلد سوم ۲؎ نگار جون ۱۹۳۸ء ۳؎ تنقید لطیف عبدالحق ص
مطبوعہ ۱۹۳۶ء ۴؎ نقد و نظر ص۱۲ ۵؎ روح تنقید حصہ دوم ص۷۸ و ۱۰۵

اظہار وغیرہ موضوع ہیں جن میں ہر ایک پر اردو کے ہر شاعر کے کلام میں کہیں کہیں شعر نکلیں گے ۔۔۔ انھوں نے (غالبؔ نے) ان مضامین پر شعر لکھے اور اس میں شک نہیں کہ اپنے مخصوص طرزِ ادا کے ذریعہ سے چار چاند لگا دیئے ۔۔۔ وہ عشقیہ شاعری جس پر ان کے سارے کلام کا انحصار ہوتا ہے ۔

ڈاکٹر سید عبد اللطیف لکھتے ہیں۔[۱]

"ہر زمانہ کے غزل گو شعراء نے شیخ و برہمن کی پھبتیاں اڑائیں صوفیوں اور فلسفیوں کی شان اختیار کی فلک پر شکایتوں کے تیر برسائے اپنی شاعرانہ برتری کے گیت گائے عاشقی کا سوانگ بھرا ساغر کے دور چلائے اور ہر قسم کے بہت سے تماشے کیئے غالب نے اس پامال رستہ سے کچھ زیادہ کنارہ کشی نہیں کی وہی پرانے موضوع اس کو اپنی شاعرانہ جولانی کے لئے ہاتھ آئے۔ جہاں نصیبی کے پرانے موضوع نے اس کی اندرونی بے اطمینانی سے ایک شخصی رنگ اختیار کر لیا یہ وہ مقام ہے جہاں وہ الگ کھڑا ہوا نظر آ رہا ہے "

مظفر خاں صاحب ایم ۔ اے لکھتے ہیں۔[۵۲]

"دوسری اہم خصوصیت اور رجحان جس نے غالب کے اس تغزل کو ابھرنے نہیں دیا "

وہ ان کا رشک ہے جس میں شعری کیفیت اور اثر آفرینی کھو گئی ہے ۔ غالب کے یہاں تغزل تو ہے لیکن ان کے تغزل میں ان کی ندرتِ تخیل طرزِ ادا اور اسلوبِ بیان نے جو شکل پسندی کے خصائص جمع کر دیئے تھے انھوں نے

---

[۱] غالب مصنفہ عبد اللطیف ص ۱۰۴ [۵۲] رسالہ برہان دہلی جنوری ۱۹۴۳ء

تغزل کی ان کیفیتوں کو جنھیں جانِ تغزل کہا جاتا ہے اور سوز و اثر جس کے لازمی نتیجے ہیں ان کے کلام میں پیدا نہیں ہونے دیا اگرچہ ان چند سادہ اور صاف غزلوں میں یہ وصف بھی موجود ہے جو انھوں نے رنگِ بیدل کو ترک کرنے کے بعد کہے۔

"مرزا غالب سلامتی فہم کے باوجود جب اس راستہ سے (معاملہ بندی سے) گزرے ہیں اور جب انھوں نے اس نغمۂ تغزل کو اپنی مضرابِ تخیل سے چھیڑا ہے تو وہ بھی خارجِ پردہ ہو کر گئے یہاں یہ مدعا نہیں کہ غالب کے تغزل کا سرے سے انکار کیا جائے بلکہ صرف یہ دکھانا ہے کہ غالب کے تغزل میں تغزل کی اصلی روح موجود نہیں ہے اور جہاں کہیں انھوں نے اس کیف کو تخلیق کیا ہے وہاں یا تو سوقیانہ پن پر اتر آئے ہیں یا بلند پروازی کی فضا میں ان کے پر و بال الجھ کر رہ گئے ہیں اور وہ کیف بھی کھو بیٹھے ہیں جو اس سوقیانہ پن میں تھا۔"

مضامینِ غالب

گل و بلبل، شمع و پروانہ، لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، لبِ نازک، زلفِ سیہ، چاہِ زنخداں، شراب و کباب، چنگ و رباب، حسن و عشق، حرمان و آلام، ساقی و دلبر، واعظ، شیخ، تصوف، اخلاق وغیرہ اردو شاعری کے یہ خاص مضامین ہیں جن پر تمام شعراء نے طبع آزمائی کی ہے۔ مرزا غالب نے بھی انھیں کو لیا ہے۔ اردو شعراء نے فارسی شعراء سے بھی استفادہ کیا ہے بعض نے فارسی اشعار کا بعینہٖ ترجمہ کیا ہے بعض نے کسی قدر تغیر سے ان کے مضامین و خیالات کو لیا ہے۔

ترجمہ کی ابتدا فارسی شعراء نے کی وہ اول اول عربی اشعار کو سامنے رکھ کر لفظی ترجمہ کرتے تھے پھر اس میں جدتیں کرنے لگے۔ یہ عمل اردو شعراء نے

نے بھی کیا ترجمہ کرنا کسی طرح بھی ہو عیب نہیں۔ مولوی عبد السلام ندوی لکھتے ہیں۔

"متاخرین[1] اساتذۂ فارسی کے عمدہ اشعار کا ترجمہ تو تقریباً اس دور (میر کا عہد) کے ہر شاعر نے کیا ہے"

خواجہ حالی لکھتے ہیں۔

"ہم[2] دیکھتے ہیں کہ ہمارے شعراء نے جو کہیں کہیں فارسی اشعار کا ترجمہ اردو اشعار میں کیا ہے ان پر لوگوں نے اعتراض کئے ہیں لیکن ہمارے نزدیک یہ کوئی اعتراض کا محل نہیں ہے۔ ایک زبان کے شعر کا اردو ترجمہ دوسری زبان کے شعر میں کرنا کوئی آسان بات نہیں"

لیکن اس طرز میں حد سے گزر جانا ضرور محلِ نظر ہو جاتا ہے۔ مرزا غالب نے کثرت سے فارسی اشعار کا ترجمہ کیا ہے اور فارسی شعراء کے جذبات وخیالات کو تغیر کے ساتھ لیا ہے میں نے اُن کے اس قسم کے (۲۵۰) اشعار منتخب کئے تھے لیکن یہاں پر صرف اُن اشعار کو لکھتا ہوں جن کا ترجمہ کرنا مرزا صاحب کے مداحوں کو تسلیم ہے شاعری میں یہ بھی ہمیشہ سے عام رواج ہے کہ متقدمین و متاخرین کے مضامین متاخرین لیتے رہے ہیں اور متقدمین کے خیالات کو بعض نے بجنسہٖ بعض نے کسی جدت کے ساتھ مختلف اسالیب سے بیان کیا ہے یہ بھی کوئی عیب نہیں۔ خواجہ حالی لکھتے ہیں۔

"اقتباسات[3] ہمیشہ متاخرین قدماء کے کلام سے کرتے رہتے ہیں اور چراغ سے چراغ جلتا چلا آیا ہے"

---

[1] شعر الہند حصہ اول صفحہ ۴۳ [2] مقدمہ شعر و شاعری صفحہ ۱۳۶ انوار احمدی پریس الہ آباد [3] مقدمہ شعر و شاعری صفحہ ۱۳۴

میں نے اس قسم کے مرزا غالب کے (۱۰۴) اشعار منتخب کیئے ہیں مرزا غالب نے معاصرین کے جو خیالات و مضامین لئیے ہیں میں نے اس طرح کے (۱۲۰) اشعار منتخب کیئے ہیں ہر قسم کے تھوڑے تھوڑے اشعار بطور نمونہ نقل کر دوں گا معاصرین کے مضامین میں یہ کہنا مشکل ہے کہ کس نے کس سے لیا ہے۔ اس طرح بھی مضامین کا لینا کوئی عیب نہیں لیکن ان امور کے اظہار کی یہاں اس وجہ سے ضرورت ہے کہ بعض لوگ مرزا صاحب کے مضامین کو خاص ان کے اپنے اور الہامی مضامین کہتے ہیں۔ مرزا غالب نے بعض اپنے فارسی اشعار کا بھی ترجمہ کیا ہے۔ میں نے اس قسم کے (۱۸) اشعار منتخب کیئے ہیں۔

فارسی اشعار اور فارسی کے شعراء کے خیالات کا ترجمہ

عرفی

ہر کس نشاسندۂ راز ست وگرنہ　　　اینہا ہمہ راز است کہ معلوم عوام است

غالب

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا　　　یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

لا اعلم

در شہرِ حسن و عشق رواجِ دگر بود　　　دشنام می دہی و دعا می کنیم ما

غالب

میں گیا بھی داں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب
تھیں دعائیں یاد جتنی صرفِ درباں ہو گئیں

ظہوری

شطبنتِ ما جہت منتش بر جانِ ما　　　محنتِ ما راحتِ ما دردِ ما درمانِ ما

غالب

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا　　　درد کی دوا پائی دردِ لادوا پایا

عرفی

منم آں سیر ز جاں گشتہ کہ با تیغ و کفن تا در خانۂ جلاد غزل خواں رفتم

غالب

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا

بیدل

منزلِ عیش تو وحشت کدۂ امکان نیست
چمن از سایۂ گل پشتِ پلنگ است این جا

غالب

نہ کی سامانِ عیش و جاہ نے تدبیر وحشت کی
ہوا داغِ زمرد بھی مجھے داغِ پلنگ آخر

خسرو

نہ ہے عمرِ درازِ عاشقاں گر شبِ ہجر از حسابِ عمر گیرند

غالب

کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں
شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

کمالی

آب و رنگِ گلستانِ عشق اکنوں از من است
عندلیباں ہرچہ می گویند مضمونِ من است

غالب

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سن کر مرے نالے غزل خواں ہو گئیں

خیام

می خوردنِ من از نہ برائے طرب است
نے بہرِ فساد و ترکِ دین و ادب است
خواہم کہ بے خودی بر آرم نفسے
می خوردن و مست بودنم زین سبب است

غالب

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو اِک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے

عرفی

عشق می گویم و می گریم زار طفلِ نادانم و اول سبق است

غالب

لیتا ہوں مکتبِ غمِ دل میں سبق ہنوز لیکن یہی کہ رفت گیا اور بود تھا

عرفی

غم نعمتیست خوردنی اما ز خوانِ عشق
اے اہلِ روزگار غمِ روزگار چیست؟

غالب

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ بچیں کہاں کہ دل ہے
غمِ عشق اگر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

عرفی

وقتِ عرفی خوش کہ نہ کشود چوں در بر رخش
بر درِ نکشودہ ساکن شد در دیگر ندید

غالب

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم
اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

بیدل

دلِ آسودۂ ما شورِ امکاں در نفس دارد
گہر دزدیدہ است اینجا عنانِ ضبطِ دریا را

غالب

گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگیٔ جاں کا
گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا

لا اعلم

دہقان کہ بکشت تخم ریزد
برقے است کہ خرمنش بسوزد

غالب

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

کمال اسمٰعیلی

کاغذی جامہ بپوشیدہ و بدرگاہ آمد
زادۂ خاطرِ من تا بہ دہی دادِ مرا

غالب

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

ظہوری

آن شکارم من کہ ہم لائق بہ کشتن نیستم
شرم می آید مرازاں کس کہ صیادِ منست

غالب

مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں
شایانِ دست و بازوئے قاتل نہیں رہا

نعمت خاں عالی

ز مردم یار می پرسد کہ عالی کیست طالع بیں
کہ عمرم در محبت رفت و کار آخر رسید این جا

غالب

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

لا اعلم

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش   من انداز قدت رامی شناسم

غالب

جلاد سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے   ہم سمجھے ہوئے ہیں اسے جس بھیس میں جو آئے

سحابی

کس نیست کہ جاں نذر تو سلامت ببرد   آں را بہ تغافل کشی ایں را بنگاہ

غالب

کرنے گئے تھے اس سے تغافل کا ہم گلہ   کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

حزیں

چہ شد ار توبہ زمی کردہ ام اے سرو سہی

پیشِ ابر کرم پیرِ مغاں ایں ہمہ نیست

غالب

میں اور بزم مے سے یوں تشنہ کام آؤں

گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا

یہ مضمون لالہ خاتون کا بھی ہے

من اگر توبہ زمے کردہ ام اے سرو سہی

تو خود ایں توبہ نہ کردی کہ مرا مے نہ دہی

بیدل

حیا را ہم نقابِ معنی نازش نمی خواہم   کہ می ترسم عرق بر جبہ بند و چشم غمازے

غالب

بدگمانی نے نہ چاہا اُسے سرگرم خرام   رُخ پہ ہر قطرہ عرق دیدۂ حیراں سمجھا

لا اعلم

بوئے گل، نالۂ دل دود چراغِ محفل   ہر کہ از بزم تو برخاست پریشاں برخاست

غالب

بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل　　جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

ملا اعلم

زخضر عمر فزون است عشق بازان را　　اگر ز عمر شمارند روزِ ہجراں را

غالب

کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں
شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

ظہیر فاریابی

صدمہ ہائے عشق را کے بوالہوس دارد قبول
کے شناسد طفل قدر سیلیٔ استاد را

غالب

اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب　　لطمۂ موج کم از سیلیٔ استاد نہیں

فیاض قمی

ہر کس کہ زخم کاریٔ یار انتظارہ کرد　　تحسین دست و بازوئے او را دعا کند

غالب

کہیں نظر نہ لگے اُن کے دست و بازو کو　　یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

خسرو

اے گل چو آمدی ز زمیں گو چگونہ اند　　آں رخہا کہ در تہِ گردِ فنا شدند

غالب

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی جو پنہاں ہو گئیں

جمال الدین اصفہانی

آں را کہ تو ئی یار چہ بے یار کس است　　واں را کہ توئی دوست چہ دشمن کام است

غالب

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے دشمن اُس کا آسماں کیوں ہو

عصمت خاں عالی

دریاب کہ ماندہ است ز دل قطرۂ خونے
آن قطرہ ہم از دست تو بریز چکیدن

غالب

بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی
سو رہتا ہے باندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی

جامی

آسماں جامِ نگوں داں کز مۓ عشرت تہی است
جستنِ مے از تہی ساغر نشانِ ابلہی است

غالب

مۓ عشرت کی خواہش ساقیٔ گردوں سے کیا کیجئے
لئے بیٹھا ہے اک دو چار جامِ واژگوں وہ بھی

نظیر

رازِ دیرینہ ز رخ پردہ برانداخت دریغ
حالِ ما شہرہ باوشائے غزل ساخت دریغ

غالب

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ   شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

شرف قزوینی

ہرت صد منت بجاں از غیبتِ بدگو مرا
چوں باین تقریب می آرد بیادِ او مرا

غالب

گرچہ ہے کس کس برائی سے ولے بایں ہمہ
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اُس محفل میں ہے

صائب

زین پیش شغلِ عشق بنا ماں نمی رسید — در روزگارِ حسنِ تو این شیوہ عام شد

غالب

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی — اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

لا اعلم

جنت نشود چارۂ افسردگیٔ دل — تعمیر باندازۂ ویرانی ما نیست

غالب

دیتے ہیں جنت حیاتِ دہر کے بدلے — نشہ باندازۂ خمار نہیں

میر معز فطرت

ہر عضو من زدست تو دارد شکایتے — چوں ارغنون لبالبم از نالہ ہائے زار

غالب

پُر ہوں میں شکوے سے یوں راگ سے جیسے باجا
اک ذرا چھیڑیئے پھر دیکھیئے کیا ہوتا ہے

ملا میلی مشہدی

دارد خموشی تا من حسرت کشیدہ را — گوید شنیدہ ام سخنِ ناشنیدہ را

غالب

زہے کرشمہ کہ یوں دے رکھا ہے ہم کو فریب — کہ بن کہے ہی انھیں سب خبر ہے کیا کہیئے

بیدل

دیدۂ را کہ بہ نظارۂ دل محرم نیست
مژہ باہم زدن از دست ندامت کم نیست

غالب

زبسکہ مشقِ تماشا جنوں علامت ہے　　کشاد و بستِ مژہ سیلیٔ ندامت ہے

بیدل

ہیچ پرواز ز خاکسترِ خود بالا نیست　　بیدل این ہفتِ فلک بیضۂ یک فاختہ ایست

غالب

نالہ سرمایۂ یک عالم و عالم کفِ خاک　　آسماں بیضۂ قمری نظر آتا ہے مجھے

عاقل خاں رازی

نہ مرا کرد رقیب از سر کوئے تو جدا　　اول این حادثہ بر آدم و حوا بگزشت

غالب

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

لا اعلم

زین نام کنم چو تر زباں را　　جاں بوسہ دہد بہ سر زباں را

غالب

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا　　کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے

سعدی

سعدیا حبِ وطن گرچہ حدیثیت صحیح　　نہ تواں مرد بسختی کہ من اینجا زادم

غالب

ہے اب اس معمورہ میں قحطِ غمِ الفت اسد
ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں کھا دیں گے کیا

لا اعلم

غرقۂ بحرِ یم مارا در دیارِ ما مپرس
نقشۂ کامِ نہنگم از مزارِ ما مپرس

غالب

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کہیں جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

بیدل

چشم واکردن کفیلِ فرصتِ نظارہ نیست
پرتوِ این شمع آغوشِ وداعِ محفل است

غالب

تا کجا اے آگہی رنگِ تماشا باختن　　چشمِ واگردیدہ آغوشِ وداعِ جلوہ ہے

لاعلم

تہی دستانِ قسمت را چہ سود از رہبرِ کامل
کہ خضر از آبِ حیوان تشنہ می آرد سکندر را

غالب

کیا کیا خضر نے سکندر سے　　اب کسے رہنما کرے کوئی

عرفی

حلہ ہا سوختہ اند اہلِ بہشت از غیرت　　تا شہیدانِ تو گلگون کفنے ساختہ اند

غالب

اک خونچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

غیاثی استرآبادی

نامت ز رشک پیشِ کسے چوں نمی برم
آیا سراغ از کہ کنم منزلِ ترا

غالب

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں　　ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

غنیمت

ز مہرش سینہا جولان گہِ برق
دلِ ہر ذرہ در جوش انا الشرق

غالب

دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر
ہم اُس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

لا اعلم

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

غالب

بلائے جاں ہے غالب اس کی ہر بات
عبارت کیا اشارت کیا ادا کیا

قاآنی

نہ آشیانۂ چرخ ایں عقاب زریں پر
بہر دریچہ زمنقار ریخت شوشۂ زر
دریچۂ فلک از نقرۂ سفید کشود
وزاں میانہ فرو ریخت دانہ ہائے گہر
بریں سپہرِ رمادی یکے لعامہ زرد
کشود بال و فرو خورد ہر چہ بود انگر
غریقِ نیل فلک شد ستارہ چوں فرعون
نمود تا یدِ بیضاء زخود کلیم سحر

غالب

صبحدم دروازۂ خاور کھلا
مہر عالمتاب کا منظر کھلا
خسروِ انجم کے آیا صرف میں
شب کو تھا گنجینۂ گوہر کھلا
سطحِ گردوں پر پڑا تھا رات کو
موتیوں کا ہر طرف زیور کھلا
صبح آیا جانبِ مشرق نظر
اک نگارِ آتشیں رخ سر کھلا

رفیع خاں باذل

عشق را با ہر دلے نسبت بقدرِ جوہر است
قطرہ بر گل شبنم و در قعرِ دریا گوہر است

غالب

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ جو گوہر نہ ہوا تھا

خسرو

بیا مطربا ساز کن پردہ را   بسوز این دلِ عشق پروردہ را

غالب

ڈھونڈے ہے اُس مغنیِ آتش نفس کو جی

جس کی صدا ہو جلوۂ برقِ فنا مجھے

لاعلم

سوادِ دیدہ حل کردم، نوشتم نامہ سوئے تو

کہ تا ہنگام خواندن چشم من افتد بروئے تو

غالب

آنکھ کی تصویر سرنامہ پہ کھینچی ہے کہ تا   تجھ پہ کھل جائے کہ مجھ کو حسرتِ دیدار ہے

عربی اشعار کا ترجمہ

میں نے متنبی کے ایسے ستائیس شعر منتخب کیئے ہیں جن کا مرزا غالب نے بعینہٖ ترجمہ کیا ہے۔ واللہ اعلم یہ اتفاق ہے یا کیا مرزا کی عربی ادب سے دلچسپی کسی روایت سے ثابت نہیں ہوتی مرزا کے احباب میں مولانا فضل حق خیرآبادی جیسے لوگوں کی موجودگی سے یہ بعید نہیں کہ انھیں ان اشعار کا مفہوم پہنچا ہو۔

ان المعین علی الصبابۃ بالا ملے   اولیٰ برحمۃ ربہا و اخائہ

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح

کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غم گسار ہوتا

یا عاذل العاشقین دع فئۃً   اضلہا اللہ کیف ترشدہا

حضرتِ ناصح گر آئیں دیدۂ و دل فرشِ راہ

کوئی مجھ کو یہ تو بتلائے کہ سمجھائیں گے کیا

وفی فواد المحب نار جویٰ احر نار الجحیم ابردھا
آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں سوزِ غمِ ہائے نہانی اور ہے

ترجمہ کے نقائص

مرزا غالب نے کثرت سے فارسی اشعار کا ترجمہ کیا ہے اور بہت زیادہ فارسی شعراء کے خیال کو لیا ہے لیکن بعض ترجمے اور خیال غیر مکمل اور ناموزوں ہیں مثلاً

لا اعلم

یاد ایامِ جنوں بر سرِ من بار دسنگ کودکاں راکہ زمکتب کسے آزاد کند

غالب

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا
یہ شعر مہمل ہے اس پر بحث کی جا چکی ہے۔

حزیں

جلوہ در خانۂ آئینہ بخود نہ نمائی گر بدانی کہ من حسرتِ دیدار چہ کرد

غالب

تماشا کر اے محوِ آئینہ داری تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں
(خانۂ آئینہ) کا ترجمہ (آئینہ داری) غلط کرکے شعر کو غلط اور مہمل کر دیا ہے۔

خسرو

اے گل بچو آمدی ز زمیں گو چگونہ اند آں روئے ہا کہ در تہِ گہ دفنا شدند

غالب

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی جو پنہاں ہوگئیں

دوسرے مصرعہ میں یہ کہنا چاہتے تھے (کیا صورتیں ہوں گی جو خاک میں پنہاں ہوگئیں) الٹا کہہ گئے۔ (خاک میں کیا صورتیں ہوں گی) مطلب کے موافق

الفاظ کو ترتیب نہ دے سکے۔

اخذِ مضامین متقدمین

(آبرو) دھمکاتے ہو ہم کو عبث باندھ کر کمر
کھولوں ابھی تو جائے میاں کا بھرم نکل

(غالب) ہے کیا جو کس کے باندھیئے میری بلا ڈرے
کیا جانتا نہیں ہوں تمہاری کمر کو میں

(بیانؔ ہمعصرِ میر) عرش تک جاتی تھی اب لب تک بھی آ سکتی نہیں
رحم آتا ہے بیاںؔ اب مجھ کو اپنی آہ پر

(غالب) نالہ جاتا تھا پرے عرش سے میرا اور اب
لب تک آتا ہے جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے

(درد) کی تو تھی تاثیر آہِ آتشیں نے اس کو بھی
جب تلک پہونچے ہی پہونچے راکھ کا یاں ڈھیر تھا

(غالب) ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

(میر) بالیں پہ میرے گھر سے وہ آوے گا جب تلک
کر جاؤں گا سفر ہی میں دنیا سے تب تلک

(میر) عشق کی سوزش نے دل میں کچھ نہ چھوڑا کیا کہیں
لگ اٹھی یہ آگ ناگاہی کہ سب گھر پھک گیا

(غالب) دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

(میر) ہم سے بن مرگ کیا جدا ہو ملال
جان کے ساتھ ہے دلِ ناشاد

(غالب) قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
مرگ سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

(میر) یہ توہم کا کارخانہ ہے   یاں وہی ہے جو اعتبار کیا

(غالب) ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

(میر) بے خودی لے گئی کہاں ہم کو   دیر سے انتظار ہے اپنا

(غالب) ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

(میر) سخت کافر تھا جن نے پہلے میر
مذہبِ عشق اختیار کیا

(غالب) تھا موجدِ عشق بھی قیامت کوئی
لڑکوں کے لئے گیا ہے کیا کھیل نکال

(مرزا مظہر) یہ دل کب عشق کے قابل رہا ہے
کہاں اس کو دماغ و دل رہا ہے

(غالب) عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

(میر) ہمیں عشق میں میر چپ لگ گئی
نہ شکر و شکایت نہ حرفِ حکایت

(غالب) ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

(میر) کاشکے دل دو تو ہوتے عشق میں
ایک رکھتے ایک کھوتے عشق میں

(غالب) میری قسمت میں غم گر اتنا تھا   دل بھی یارب کئی دیئے ہوتے

(قائم چاندپوری) ظالم تو میری سادہ دلی پر تو رحم کر
روٹھا تھا تجھ سے آپ ہی اور آپ من گیا

(غالبؔ) ان دل فریبیوں سے نہ کیوں اس پہ پیار آئے
رُوٹھا جو بے گناہ تو بے عذر من گیا

یہ شعر غالب نے غلام غوث خاں بیخبر کو لکھا تھا۔ (نگار جنوری ۱۹۳۱ء)

(قائم) کو نوحہ گر کہ خاک پہ میری ہو گرمِ آہ
تھا اک چراغِ گور سو وہ بھی خموش ہے

(غالب) داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

(قائم) دل ڈھونڈنا سینے میں مرے بوالعجبی ہے
اک ڈھیر ہے یاں راکھ کا اور آگ دبی ہے

(غالب) تم اپنے شکوہ کی باتیں نہ کھود کے پوچھو
حذر کرو مرے دل سے کہ اس میں آگ دبی ہے

(تاباں دہلوی) تیری ابرو سے مرا دل نہ چھٹے گا ہرگز
گوشت ناخن سے کہو کوئی جدا ہوتا ہے

(غالب) دل سے مٹنا تری انگشت حنائی کا خیال
ہو گیا گوشت کا ناخن سے جدا ہو جانا

(حزیں) گوارا ہو گیا دل پر ہمارے جورِ یار آخر
ہمیں دردِ الم کی آگئی صحبت برار آخر

(غالب) رنج کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

(حسن) میں حشر کو کیا روؤں کہ اٹھ جانے سے تیرے
برپا ہوئی اک مجھ پہ قیامت تو یہیں اور

(غالب) جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اوَر

(ممنون) تفاوت قامتِ یار اور قیامت میں ہے کیا ممنون
وہی فتنہ ہے لیکن یاں ذرا سانچے میں ڈھلتا ہے

(غالب) ترے سرو قامت سے اک قدِ آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

(یقین) اگر بخیر ہمیں یاد کر نہیں سکتا
کبھو برا ہی ہمیں کہہ ترا بھلا ہوگا

(غالب) قطع کیجے نہ تعلق ہم سے کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

(یقین) شکوۂ حسن سے آنسو ہمارے سوکھ جاتے ہیں
یقیں سورج کے آگے کب اثر رہتا ہے شبنم کا

(غالب) پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

(یقیں) عمر فریاد میں برباد گئی کچھ نہ ہوا
نالہ مشہور غلط ہے کہ اثر رکھتا ہے

(غالب) غلطی ہائے مضامیں مت پوچھ
لوگ نالہ کو رسا باندھتے ہیں

(مصحفی) کیا گرم اختلاط کسی سے ہوں مصحفی
فرصت ہے زندگی کی بقدر شرر ہمیں

(غالب) یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل
گرمئ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک

(منتظر) چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستم گاری میں
کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

(غالب) فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں یاد اس کو اسد
جفا میں اس کی ہے انداز کار فرما کا
(شہزادہ مرزا فخرالدین حشمت نبیرہ شاہ عالم ثانی)
اشک باری تو نہ اتنی کر خدا کے واسطے
غرق اک عالم ابھی اے چشم تر ہو جائے گا
(غالب) غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے
بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کیے ہوئے
(شہزادہ مرزا علاؤالدین آرزو نبیرہ شاہ عالم)
نہ ان کو سننے کی طاقت نہ مجھ کو کہنے کی
سنے ہے کون کہے کون اور بیاں کیسا
(غالب) ادھر وہ بدگمانی ہے ادھر یہ ناتوانی ہے
نہ پوچھا جائے ہے اس سے نہ بولا جائے ہے مجھسے
(مرزا احمد علی بیگ قیس لکھنوی شاگرد جعفر علی حسرت)
جب سے لگی اُس بتِ کافر سے آنکھ
موت تو کیا نیند بھی آتی نہیں
(غالب) موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
(مصحفی) مصحفی فارسی کو طاق پہ رکھ
اب ہے اشعار ہندی کا رواج
(مصحفی) کیا ریختہ کم ہے مصحفی کا
بو آتی ہے اس میں فارسی کی
(غالب) اگر کوئی پوچھے ریختہ کیسے ہو رشکِ فارسی
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اُسے سنا کہ یوں

(میر) سرا ہا اُن نے ترا ہاتھ جن نے دیکھا زخم
شہید ہوں میں ترے تیغ کے لگانے کا

(غالب) کہیں نظر نہ لگے ان کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

(میر) کون کہتا ہے نہ غیروں پہ تم امداد کرو
ہم فراموش ہوؤں کو بھی کبھو یاد کرو

(غالب) تم جانو غیر سے جو تمہیں رسم و راہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

(میر) عشق ان کو ہے جو یار کو اپنے دمِ رفتن
کرتے نہیں غیرت سے خدا کے بھی حوالے

(غالب) قیامت ہے کہ ہوئے مدعی کا ہم سفر غالب
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

(اثر) حالِ دل مثلِ شمع روشن ہے
گو مجھے بات کہ نہیں آتی
کیا کہوں آہ میں کسو کے حضور
نیند کس بات پر نہیں آتی
نہیں معلوم دل پہ کیا گزری
ان دنوں کچھ خبر نہیں آتی

(غالب) ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی
موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

(ہدایت) ابروئے چشم بتاں کو بھی ہدایت عشق ہے
جس جگہ مسجد بنی ساتھ اس کے میخانہ بنا

(غالب) بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیئے
مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیئے

معاصرین کے مضامین

ناسخ و آتش اگرچہ غالب ہی کے دور کے شعراء میں سے ہیں لیکن ان کو غالب پر تقدم حاصل ہے۔ غالب نے خود لکھا ہے کہ میری شاعری کی ابتدا تھی کہ دیوانِ ناسخ دہلی میں پہنچا اس لئے ناسخ اور آتش کے جو مضامین غالب کے اشعار میں ہیں ان میں یقیناً ناسخ و آتش کو تقدم حاصل ہے باقی ذوق و مومن وغیرہ کے اشعار میں نہیں کہا جا سکتا کہ کس نے کس سے لیا؟

(ناسخ) مرا سینہ ہے مشرق آفتابِ داغِ ہجراں کا
طلوعِ صبح محشر چاک ہے میرے گریباں کا

(غالب) لوگوں کو ہے خورشیدِ جہاں تاب کا دھوکا
ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغِ نہاں اور

(ناسخ) شکل نظر پڑی نہیں آیا نہیں پیام بھی
عمر ہوئی کہ ایک سی حالتِ چشم و گوش ہے

(غالب) نے مژدۂ وصال نہ نظارۂ جمال
مدت ہوئی کہ آشتیٔ چشم و گوش ہے

سرقہ کی چار قسمیں ہیں ان میں سے ایک قسم کو نقل کہتے ہیں کسی کے شعر کے مضمون و الفاظ کو کسی قدر تصرف و تبدل سے لے لینا ۔۔۔ غالب کا یہ شعر اسی قسم کی مثال ہے۔

(ناسخ) جیتے ہیں ظلمتِ شب فرقت کو کر کے طے
کچھ خضر سے بھی عمر ہماری دراز ہے

(غالب) کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں
شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

(آتش) اپنے جانے سے ہوں میں میکشِ مفلس باہر
رہن ہوتی ہوئی دستار و قبا پھرتی ہے

(غالب) رکھتا پھروں ہوں خرقہ و سجادہ رہن مے
مدت ہوئی ہے دعوتِ آب و ہوا کیے

(آتش) اُڑتا ہے شوقِ راحتِ منزل میں اسپ عمر
مہمیز کس کو کہتے ہیں اور تازیانہ کیا

(غالب) رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

(ناسخ) صدقہ ہو تیری چال پر کیوں نہ نسیم ہر سحر
نقشِ قدم سے رہ گزر دامنِ گل فروش ہے

(غالب) دیکھو تو دل فریبیٔ اندازِ نقشِ پا
موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی

(ناسخ) اشک تھم جائیں جو فرقت میں تو آہیں نکلیں
خشک ہو جائے جو پانی تو ہوا پیدا ہو

(غالب) آہ سے گریہ مبدل بہ دمِ سرد ہوا
باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

(ناسخ) رکھو کسی طرح تو سرِ دکار مہرباں
کرتے رہو جفا ہی وفا گر نہ ہو سکے

(غالب) اگر بغیر ہیں یاد کر نہیں سکتا کبھی بُرا ہی کہ آخر نہ بھلا ہوگا

(ذوق) کیا اعتبارِ ہستیٔ ناپائیدار کیا
چشمک ہے برق کی کہ تبسم شرار کا

(غالب) یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل
گرمیِ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک

(ذوق) میکدے میں ایک پگڑی کل ہوئی تھی رہن مے
ذوق وہ تیری ہی دستارِ فضیلت تو نہ ہو

(غالب) رکھتا پھروں ہوں خرقہ و سجادہ رہن مے
مدت ہوئی ہے دعوتِ آب و ہوا کیے

(ذوق) گذرتی عمر ہے یوں دورِ آسمانی میں
کہ جیسے جائے کوئی کشتیٔ دخانی میں

(غالب) جہازِ عمرِ رواں پر سوار بیٹھے ہیں
سوار خاک ہیں بے اختیار بیٹھے ہیں

(ذوق) دیکھا آخر کو نہ پھوڑے کی طرح پھوٹ گئے
ہم بھرے بیٹھے تھے کیوں آپ نے چھیڑا ہم کو

(غالب) ہوں سراپا سازِ آہنگِ شکایت کچھ نہ پوچھ
ہے یہی بہتر کہ لوگوں میں نہ چھیڑے تو مجھے

(مومن) اُس نقشِ پا کے سجدے نے یاں تک کیا ذلیل
میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

(غالب) جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار
اے کاش جانتا نہ تری رہ گزر کو میں

(مومن) اگر غفلت سے باز آیا جفا کی تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

(غالب) ظلم کر ظلم اگر لطف دریغ آتا ہے
تو تغافل میں کسی رنگ سے معذور نہیں

(مومن) کس پہ مرتے ہو آپ پوچھتے ہیں
ہم کو فکرِ جواب نے مارا

(غالب) پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

(مومن) تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانا کرلے
ہم تو کل خواب عدم میں شب ہجراں ہوں گے

(غالب) آئے ہے بیکسیٔ عشق پہ رونا غالب
کس کے گھر جائے گا طوفانِ بلا میرے بعد

(مومن) وقتِ جوشِ بحر گریہ میں جو محوِ نالہ تھا
حلقۂ گرداب ہر اک شعلۂ جوالہ تھا

(غالب) شب کہ برقِ سوزِ دل سے زہرۂ ابر آب تھا
شعلۂ جوالہ ہر اک حلقۂ گرداب تھا

(مومن) رشکِ پیغام ہے عناں کشِ دل
نامہ بر راہ زن نہ ہو جائے

(غالب) ہو لئے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ
یارب اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا

(مومن) وہ آئے ہیں پشیماں لاش پر اب
تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے

(غالب) کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ
ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

(تسکین) کوچۂ یار میں میں نے تسکیں پانوں رکھا تھا کہ سر یاد آیا
(غالب) میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

(صبا) جمشید اپنے وقت کا ہوں میں فقیر مست
جامِ جہاں نما ہے پیالہ سفال کا

(غالب) اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
جامِ جم سے یہ مرا جامِ سفال اچھا ہے

اخذِ مضامین میں نقائص

قدما اور معاصرین کے بہت سے مضامین مرزا غالب کے کلام میں موجود ہیں۔ صفائی زبان و بیان میں مرزا صاحب سے سب بہتر ہیں۔ مرزا صاحب کے خیالات میں بعض جگہ ترفع ہے لیکن پیچیدگیِ بیان و اغلاق و اغلاط یہ ایسے عیوب ہیں جن کے سامنے اس حُسن کی کوئی ہستی نہیں۔

مضامین و خیالات کے لینے میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ اخذ کرنے والے نے مضمون کو پہلے شاعر سے اچھی طرح ادا کیا ہے یا نہیں اگر خوبی سے ادا کیا ہے تو قابلِ داد ہے ورنہ لائقِ رد ہے۔

مرزا صاحب نے اخذ مضامین میں بعض جگہ بھدا پن پیدا کر دیا ہے اور بعض جگہ غلطی کر گئے ہیں۔ مثلاً

(میر) اٹھتی نہیں حیا سے تاہم فلک بھی پہنچیں
پھرتی ہیں وہ نگاہیں پلکوں کے سایہ سایہ

(غالب) وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار
جو مری کوتاہیٔ قسمت سے مژگاں ہوگئیں

مژگاں کے سایہ سایہ کو لینا چاہتے تھے اور اس ہی کی ضرورت تھی مگر نہ لے سکے۔

(یقین) عمر فریاد میں برباد گئی کچھ نہ ہوا
نالہ مشہور غلط ہے کہ اثر رکھتا ہے

(غالب) غلطی ہائے مضامین مت پوچھ
لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں

(آتش) ہوگیا سلسلۂ مہر و محبت برہم
نازنیں بھول گئے نامۂ داد امیر کے بعد

(غالب) منصبِ شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا
ہوئی معزولی انداز و ادا میرے بعد

آتش کا شعر بلند ہے۔ آغا باقر نے بھی بیانِ غالب میں اس کا اقرار کیا ہے۔ مرزا کا شعر بھدّا ہے۔

(ذوق) کہتے ہیں آج ذوق جہاں سے گزر گیا
کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

(غالب) یہ لاش بے کفن اسدِ خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

ذوق کا شعر بہت بلند ہے محاورہ اور روزمرہ خوب ہے۔

(ذوق) اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

(غالب) عمر بھر دیکھا کئے مرنے کی راہ
مر گئے پر دیکھئے دکھلائیں کیا

اس شعر کے متعلق شمس العلماء پروفیسر عبد الرحمٰن لکھتے ہیں۔[۱]

مرزا غالب نے سنا (ذوق کا شعر) تو باایں ہمہ کمال و خود پسندی بہت پسند آیا کہ خود بھی کہا یا کہہ چکے تھے ۔۔۔ یہ بھی شعر ہے (غالب کا) اور وہی بات ہے مگر وہ شان کہاں (دکھلائیں) نے شعر کی صورت ہی نہیں بگاڑی معنی کو بھی پست کر دیا۔

اور اس قسم کی بہت سی مثالیں ہیں۔

---

[۱] مراۃ الشعر ص۲۷

فارسی کلیاتِ غالب کے اشعار کا ترجمہ

مرزا غالب نے اپنے بعض فارسی اشعار کا اردو میں خود ترجمہ کیا ہے۔

(فارسی) چرا بہ سنگ وگیاہ پیچی اے زبانہ طور

زراہِ دیدہ بدل در رو وز جان برخیز

(ترجمہ) گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر

دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھکر

(فارسی) گفتنی نیست کہ بر غالبِ ناکام چہ رفت

می توان یافت کہ ایں بندہ خداوند نداشت

(ترجمہ) زندگی اپنی جب اس رنگ سے گزری غالب

ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

(فارسی) ناکس بہ تنومندی ظاہر نہ شود کس

چون سنگِ سرِ راہ گراں است وگراں نیست

(ترجمہ) قدرِ سنگِ سرِ رہ رکھتا ہوں

سخت ارزاں ہے گرانی میری

(فارسی) دیگر ز سازِ بیخودیِ ما صدا مجوی

آواز از گسستنِ تارِ خودیم ما

(ترجمہ) نہ گلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز

میں ہوں اپنی شکست کی آواز

(فارسی) بہ تن چپیدہ بازم از نم خوتا بہ پیراہن

خراشِ سینہ سطرِ بخیہ شد چاکِ گریبانم

(ترجمہ) چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیراہن

ہماری جیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہے

ان کے علاوہ اور بھی اشعار ہیں۔

مضامین کی کیفیت

جو مضامین اردو شاعری کے مخصوص ہیں اور جن کو تمام اساتذہ باندھتے چلے آئے ہیں مرزا غالب کے دیوان میں بھی وہی مضامین ہیں جس طرح قدماء کے مضامین کو بعد والوں نے اول بدل کر کچھ تغیر و تجدد سے لیا ہے یہی کام مرزا غالب نے کیا ہے ان کے مضامین اُن کے طبع زاد اور الہامی نہیں ہیں دوسرے استادوں سے زیادہ ان میں کوئی بات نہیں ہے۔ انھوں نے خود اپنے مضامین کے متعلق لکھا ہے۔

"آرائش[1] مضامین کے واسطے کچھ تصوف کچھ نجوم لگا رکھا ہے ورنہ سوائے موزونیت طبع کے یہاں کیا رکھا ہے۔"

دیوانِ غالب

مرزا صاحب نے پہلے ایک ضخیم دیوان مرتب کیا تھا لیکن جب ان کو اپنے کلام کے عیوب و نقائص نظر آئے تو اس کو تلف کر دیا پھر دوسرا دیوان جمع کیا اس کا بھی زیادہ حصہ دیوانِ سابق کے موافق تھا۔ آخر احباب کے مشورے سے اس میں سے انتخاب کرایا گیا پھر اس میں خود اضافہ کر کے شائع کرایا جو اب رائج ہے۔ پروفیسر آزاد لکھتے ہیں۔

"مولوی[2] فضلِ حق اور مرزا خاں عرف مرزا خانی شاگردِ قتیل نے مرزا کے کلام کا انتخاب کر کے موجودہ دیوان مرتب کیا۔"

ڈاکٹر زور لکھتے ہیں۔

"ایسے[3] اشعار نکال دیئے جو مرزا کی شاعری کو بدنام کرنے والے تھے۔"

---

[1] مرآۃ الشعر ص۲۷ [2] آبِ حیات ذکرِ غالب [3] سرگزشتِ غالب ص۳۹

آغا طاہر نبیرۂ آزاد لکھتے ہیں۔

"مگر سارا[1] دیوان چھپوانا بہت خطرناک تھا لہٰذا انتخاب کیا گیا۔ یہ سترہ سو شعر کا انتخابی گلدستہ ہے"

مرزا غالب نے اپنے کلام کے متعلق خود لکھا ہے۔

"ابتدائے[2] فکر سخن میں بیدل و اسیر و شوکت کے طرز میں ریختہ لکھتا تھا چنانچہ ایک غزل کا مقطع ہے۔

طرزِ بیدل میں ریختہ لکھنا — اسد اللہ خاں قیامت ہے

پندرہ برس کی عمر سے پچیس برس کی عمر تک مضامین خیالی لکھے گئے دس برس میں بڑا دیوان جمع ہو گیا آخر جب تمیز آئی تو اس دیوان کو دور کیا اوراق یک قلم چاک کئے دس پندرہ شعر واسطے نمونے کے دیوانِ حال میں رہنے دیئے گئے"

مہر صاحب لکھتے ہیں۔

"مولانا[3] فضلِ حق خیرآبادی اور مرزا خانی کوتوالِ دہلی نے انتخاب کے وقت کل (۱۷۴۳) اشعار لئے"

سنہ ۱۹۵۶ء میں مولوی محمد زکریا خاں صاحب زکی تلمیذ مرزا غالب بدایوں میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس تھے۔ ایک دن مولوی دلدار علی مذاق تلمیذ ذوق سے فرمایا کہ مولوی فضلِ حق وغیرہ نے جو انتخاب کیا تھا اس میں بعد کو مرزا صاحب نے خود بھی اضافہ کیا۔

مالک رام[4] صاحب لکھتے ہیں۔

"مرزا کا اردو دیوان غدر سے پہلے دو بارہ چھپا تھا جب انھوں نے

---

[1] مقدمہ مراۃ الغالب ص۸ [2] غالب مصنفہ مہر ص۳۸۹ [3] غالب مصنفہ مہر ص۲۶۳ [4] ذکر غالب۔

مولوی فضل حق صاحب خیرآبادی اور دوسرے دوستوں کے
مشورہ سے اپنا رنگ سخن بدلا تو اپنے پہلے کلام کا ایک انتخاب بھی
کیا یہی انتخاب پہلی بار ۱۲۵۷ھ مطابق سنہ ۴۲-۱۸۴۱ء میں شائع ہوا
اس میں کل (۱۰۷۲) اشعار تھے۔ دوسرا ایڈیشن ۱۲۷۱ھ مطابق
۱۸۵۵ء میں شائع ہوا اس میں (۱۷۹۲) شعر تھے ۱۸۶۱ء میں ایک
انتخاب انھوں نے نواب کلب علی خاں کی فرمائش سے کیا تھا جو کتب خانہ
رام پور میں موجود ہے"

صاحب آثار غالب نے لکھا ہے ۱۸۴۱ء میں مرزا کا دیوان سید المطابع دہلی میں
سرسید کے بھائی سید محمد نے چھاپا پہلے کلام کا انتخاب کہاں سے آیا وہ تو پچیس
برس کی عمر میں یعنی ۱۸۲۲ء میں تلف کر دیا گیا تھا انھوں نے خود لکھا ہے اس میں
سے دس پندرہ شعر باقی تھے اور ۱۸۴۲ء میں جب مالک رام صاحب دیوان کا
پہلی مرتبہ شائع ہونا بیان کرتے ہیں اس وقت مرزا کی عمر (۴۵) سال تھی اس
لئے یہ انتخاب پہلے دیوان کا انتخاب نہیں ہے دوسرے دیوان کا ہے جبر حسنا
لکھتے ہیں۔

"غالب[۱] نے ابتدا میں مرزا بیدل کے رنگ میں اردو شعر کہنے شروع
کئے تھے اور دس برس کی مدت میں ایک دیوان جمع کر لیا تھا جب
ہوش آیا اور شاعری کی حقیقت سے آگاہ ہوئے تو ان میں سے
صرف تھوڑے اشعار باقی رکھے باقی قلم انداز کر دیئے قلم انداز
کئے ہوئے اشعار کا ایک مجموعہ اعلیٰ حضرت نواب حمید اللہ خاں
بہادر فرماں روائے بھوپال کی توجہات عالیہ سے نسخہ حمیدیہ
کے نام سے شائع ہو چکا ہے"

---

[۱] غالب مصنفہ مہر صفحہ ۲۹

قلم انداز نہیں کیئے چاک کر کے تلف کر دیئے اس میں سے صرف دس پندرہ شعر کا رکھنا انھوں نے خود بیان کیا ہے اُس مجموعہ کا تو وجود بھی نہ رہا تھا نسخۂ حمیدیہ وہ نہیں ہے۔ جب وہ دیوان تلف کیا گیا اس وقت تو بقول مہر مرزا کو ہوش بھی نہ آیا تھا نہ وہ اس وقت تک اس طرح روشناس خلق ہوئے تھے کہ کسی نے ان کے دیوان کی نقل حاصل کی ہو نسخۂ حمیدیہ میں وہ کلام ہے جسے دوسرے دیوان میں سے مولوی فضل حق وغیرہ نے خارج کر دیا تھا۔

مالک رام لکھتے ہیں۔

"قاضی فضل حق کے کہنے پر غالب نے اپنے دیوان کا ایک انتخاب کیا جواب متداول ہے"[۱]

تمام تذکرہ نویس لکھ رہے ہیں کہ انتخاب مولوی فضل حق اور مرزا خان نے کیا۔ مگر مالک رام تصنیف کرتے ہیں کہ مرزا نے خود انتخاب کیا جس طرح مرزا غالب کے بیان میں تضاد ہے اسی طرح ان کے سوانح نگاروں کے بیانات میں بھی تضاد ہے نسخہ حمیدیہ میں مرزا کا وہ کلام ہے جسے مرزا کے احباب اور خود مرزا نے مسترد کر دیا تھا اور ان بزرگوں میں سے کوئی بھی اس کی اشاعت کا خواہاں نہ تھا وہ ایسا مجموعہ ہے جس سے مہملات اور اغلاط کی طویل فہرست مرتب ہو سکتی تھی اور جو مرزا کی شاعری کو بدنام کرنے والا تھا۔

یہ امر بھی لائقِ توجہ ہے کہ مولوی فضل حق اور مرزا خان جنھوں نے کلام غالب کا انتخاب کیا اس زمانے کے اساتذہ میں سخنوری و سخن سنجی میں ان کا کیا مرتبہ تھا مولوی فضل حق زبردست عالم تھے فنِ منطق کے امام تھے، اردو و فارسی کے شاعر نہ تھے مرزا خاں قتیل کے شاگرد تھے۔ ان کے استاد مرزا قتیل کے متعلق مرزا غالب کا فتویٰ ہے۔

---

[۱] ذکرِ غالب ص ۲۵

گرچہ بیدل ز اہلِ ایران نیست
لیک ہمچو قتیل ناداں نیست

مشہور مثل ہے جیسے نل ویسے پھل

اس کے علاوہ بڑے بڑے اساتذہ کے تلامذہ میں نارسا ذہن و کند طبیعت اور معمولی شعر کہنے والے لوگ بھی ہوتے ہیں۔

مرزا خاں کے متعلق دہلی کے مشہور استاد مرزا غالب کے خسر نواب الٰہی بخش خاں معروف کا قول آزاد نے آبِ حیات میں ذوق کے ذکر میں نقل کیا ہے۔

"ایک دن دونوں صاحب (مرزا خان اور منشی محمد حسن) الٰہی بخش خاں مرحوم کی ملاقات کو آئے اور تعارف رسمی کے بعد شعر کی فرمائش کی انھیں اور لوگوں کی طرح یہ عادت نہ تھی کہ خواہ مخواہ جو آئے اسے اپنے شعر سنانے لگیں اگر کوئی فرمائش کرتا تھا تو بات کو ٹال کر پہلے اس کا کلام سن لیتے تھے شاعر نہ ہوتا تو کہتے کہ کسی اور استاد کے دو چار شعر پڑھئے جو آپ کو پسند ہوں جب اس کی طبیعت معلوم کر لیتے تو اس رنگ کا شعر اپنے اشعار میں سے سناتے اسی بنیاد پر ان سے کہا کہ آپ دونوں صاحب کچھ کچھ اشعار سنائے انھوں نے کچھ شعر پڑھے بعد اس کے الٰہی بخش خاں مرحوم نے دو تین شعر وہ بھی ان کے اصرار سے پڑھے اور ادھر ادھر کی باتوں میں ٹال گئے جب وہ چلے گئے مجھ سے کہنے لگے میاں ابراہیم (ذوق) تم نے دیکھا اور ان کے اشعار بھی سنے محبوب مجہول الکیفیت ہیں کچھ حال نہیں کھلتا کہ ہیں کیا یہی مرزا خاں اور منشی صاحب ہیں جن کی سخن پردازی اور نکتہ رسی کی اتنی دھوم ہے بھلا یہ کیا کہیں گے اور کیا سمجھیں گے۔"

غالباً یہی وجہ تھی کہ مرزا غالب ان کے انتخاب پر مطمئن نہ تھے اور جب انھوں نے دیوان مرتب کیا تو ناسخ سے درخواست کی کہ آپ اس[۵۱] پر نظر ڈال لیں۔

---

[۵۱] رسالہ جوہر عبد الحق نمبر مرتبہ جامعہ ملیہ دہلی ۱۹۴۰ء

مرزا غالب چوں کہ مشہور آدمی تھے اس لئے لوگوں کو خیال تھا کہ دیوان ضخیم ہوگا جب شائع ہوا تو دو ورقی مجموعہ نکلا اس پر ایک معاصر نے چوٹ کی۔

ڈیڑھ جزو پر بھی تو ہے مطلع و مقطع غائب
غالب آسان نہیں صاحب دیوان ہونا

کچھ عجب نہیں کہ اسی طنز سے متاثر ہوکر مرزا نے یہ شعر کہا ہو۔

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

موجودہ دیوان کے متعلق شمس العلماء اثر لکھتے ہیں۔

"اگر ان[1] کے دیوان کا کوئی انتخاب جدید کیا جائے تو لازم ہے کہ ایسے ایسے مغلق اشعار خارج از دیوان کر دیئے جائیں۔"

مہر صاحب لکھتے ہیں۔

"غالب[2] کے بعض ان اشعار کی وجہ سے جن میں فارسیت زیادہ اور معانی معمولی ہیں ان کی عظمت و کمال کا حقیقی کمال عام لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو رہا ہے اور غالبیت کی غلط تصویر نے جو مروجہ دیوان کے عام مطالعہ کا لازمی نتیجہ تھا بہتیرے لوگوں کو اس راستے پر ڈال دیا ہے جو غالب کا راستہ یقیناً نہ تھا۔"

دوسری جگہ لکھتے ہیں۔

"اس بات[3] کی بھی ضرورت ہے کہ سارا کلام سامنے رکھ کر ایک ایسا انتخاب کیا جائے جو غالب کے صحیح رنگ کا مرقع ہو۔"

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دیوان جس میں کم و بیش اٹھارہ سو اشعار ہیں ایک ایسا مجموعہ ہے جس میں مہمل اشعار اور ایسے اشعار جن میں اغلاط ہیں زیادہ ہیں اور

---

[1] کاشف الحقائق صفحہ ۱۲۶ [2] غالب مصنفہ مہر صفحہ ۴۶۵ [3] غالب مصنفہ مہر صفحہ ۴۰۱

ایک کثیر تعداد ایسے اشعار کی ہے جو بعید الفہم ہیں اور جن کی زبان کو نہ اردو کہا جا سکتا ہے نہ فارسی اس مجموعہ میں سے اگر صحیح انتخاب کیا جائے تو وہی چار سو پانسو اشعار رہتے ہیں جو مولوی فضل حق وغیرہ نے منتخب کئے تھے. مرزا غالب نے خود بھی نواب کلب علی خاں والئ رام پور کے لئے جو انتخاب کیا تھا اس میں سے دقیق اشعار نکال دیئے تھے وہ انتخاب از نام ارمغانِ غالب اب شائع ہو گیا ہے اس کے متعلق سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں۔

"ان[1] کا بہترین کلام وہی ہے جو صاف اور سلیس ہے اس انتخاب سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے اس میں مشکل سے کوئی پیچیدہ شعر مل سکتا ہے۔"

اس انتخاب کا یہ اثر ہوا کہ نواب کلب علی خاں نے پھر ان کی طرف کچھ توجہ نہ کی مرزا صاحب نے بار بار عرضیاں لکھیں مرزا داغ کو وسیلہ گردانا مگر نواب صاحب نے کچھ جواب نہ دیا یہ راز مرزا کے ان خطوط سے منکشف ہوتا ہے جو رام پور سے شائع ہوئے ہیں یہ امر مسلمہ ہے کہ نواب صاحب ذی علم اور مشاق سخنور اور قدر دان تھے مگر مرزا کی طرف توجہ نہ کی مرزا غالب کو خود بھی اپنے اردو کلام کا اکثر حصہ پسند نہ تھا۔ مہر صاحب لکھتے ہیں۔

"خود[2] اس دیوان کو یا اردو کلام کو اپنے خداداد کمالات کا صحیح مظہر نہیں جانتے تھے بلکہ باعثِ ننگ گردانتے تھے۔"

دوسری جگہ لکھتے ہیں۔

"غالب[3] کی یہ رائے (گذر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگِ من است) اپنے اردو اشعار کے متعلق ہے۔"

یہ دونوں قول صحیح معلوم ہوتے ہیں لہٰذا اس کلام میں آج کل غالب پرست جو

۱؎ معارف فروری ۴۵ء ۲؎ غالب مصنفہ مہر ص ۱۹۱ ۳؎ غالب مصنفہ مہر ص ۴۵۸

برگ و بار نگار رہے ہیں اور اُس کی مداحی میں بے سرے ترانے الاپ رہے ہیں۔ ان کو لغو اور غلط کہنا تو صحیح ہو ا اور اُن لوگوں کی یہ حرکت ادب و فن کے لئے مضرت رساں اور گمراہ کن ہوئی۔ نیاز فتحپوری لکھتے ہیں۔

"علاوہ ان کے ناموس تھا لیلیٰ آشنا۔ رخسار دوست۔ بیاباں پر گردن پر وغیرہ متعدد غزلیں اس قابل ہیں کہ ان کو دیوان سے نکال دینا چاہیئے۔ اس طرح ایک چوتھائی حصہ تو کم ہو جائے گا لیکن اس کے بعد جو کچھ رہ جائے گا وہ ایسی چیز ہوگی جس کا جواب نہ ہوگا۔"

بس مرزا صاحب کا وہی کلام لائق پسند ہے جو مولوی فضل حق وغیرہ نے منتخب کیا تھا جس کی تعداد پانسو کے قریب ہے لیکن وہ بھی ایسا نہیں کہ جس کی مثیل و نظیر دوسرے استادوں کے یہاں نہ ہو جس طرح دیگر اساتذہ کا عمدہ کلام لاجواب ہوگا اسی طرح مرزا کا یہ انتخاب لاجواب ہوگا۔

موجودہ دیوان ہی اس امر کی دلیل ہے کہ مرزا کو نظم میں اردو زبان پر پوری قدرت حاصل نہ تھی کسی غزل کا ایک شعر ہے کسی کے دو شعر ہیں کہیں مطلع ہے کہیں مقطع ہے۔ یہ انتخاب مبصرین نے اس ہی طرح کیا ہے جیسے استاد نومشق شاگرد کی تمام غزل کو کاٹ کر پھینک دیتا ہے اور دو ایک شعر رہنے دیتا ہے کہ بس یہ شعر اچھے ہیں اور شاگرد بھی اپنا قصور سمجھ کر خاموشی سے اس پر اظہارِ رضا کرتا ہے۔ چوں کہ مرزا فارسی شاعری کے استاد تھے وہ جب اپنے اردو کلام کے معائب سے آگاہ ہوئے تو انھوں نے اس کے کثیر حصہ کو قلمزد کر دیا ورنہ کون اپنے جگر کے ٹکڑوں کو ذبح کرتا ہے کیا عجیب اور مضحکہ انگیز معاملہ ہے کہ اپنے جس کلام کو خود شاعر قلم انداز کر چکا مولوی فضل حق اور مرزا خانی مسترد کر چکے کم و بیش نصف صدی کے بعد ہندوستان میں ایسے علامہ اور مجدد فن پیدا ہوئے کہ ان میں سے نکات پیدا کر رہے ہیں اور نہیں سمجھتے کہ ان کے اس طرزِ عمل سے مرزا غالب اور ان کے احباب کی ہیجدانی

۱؎ نگار جون ۳۵ء

پر مہر لگتی ہے۔ ان کی اس نکتہ سازی سے ثابت ہوتا ہے کہ شاعر کوئی اچھا شاعر اور صاحبِ علم نہ تھا اتفاقیہ طور پر اُس کے دماغ میں اس قسم کے جملے اور الفاظ آگئے جو علوم و نکات کا مخزن ہیں اور وہ ان کو نہ سمجھا ورنہ ترک کر گیا اگر اہلِ علم و صاحبِ فہم ہوتا تو ایسا نہ کرتا۔ غالب کے شارحین اور نقادوں اور مداحوں نے بھی اپنی علمیت اور معلومات کا برمحل استعمال نہیں کیا اور خواہ مخواہ نکتہ سازی کر گئے۔ مرزا غالب کے تمام دیوان میں زیادہ سے زیادہ پانسو اشعار اچھے نکل سکتے ہیں اور ان میں وہی مضامین ہیں جو اردو کے تمام شعراء کے یہاں ہیں جس طرح دیگر اساتذہ نے ان کو جدت سے ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسی طرح مرزا نے بھی سعی کی ہے اور ان کی یہ جد وجہد ایک حد تک کامیاب رہی ہے۔ یہ مختصر تعداد اشعار کی واقعی مرزا غالب کے لئے مایۂ ناز ہے۔ فلسفہ، نجوم، ہیئت وغیرہ علوم کی طرف جس طرح دوسروں کے یہاں اشارات ہیں اسی طرح مرزا کے کلام میں بھی ہیں ایسے الفاظ و اشارات سے کسی کو حکیم و فلسفی نہیں قرار دیا جا سکتا۔ مرزا نے خود ایک جگہ اس کا اعتراف کیا ہے یہ حوالہ ہم نے کہیں نقل کر دیا ہے۔ مرزا کے خاص مداح مولوی محمد مہدی نے بھی ایسا ہی خیال ظاہر کیا ہے وہ لکھتے ہیں[1]:۔

"مرزا صاحب کا کوئی خاص فلسفہ نہیں نہ تصوف میں کوئی خاص مسلک ہے"

مرزا غالب کے موجودہ دیوان میں دیوانِ سابق کے جو اشعار ہیں ان کے متعلق شیخ محمد اکرم آئی سی ایس آثارِ غالب صـ ۲۱۱ پر لکھتے ہیں۔

"یہ اشعار شاعرانہ حسن سے بھی عاری ہیں ان میں آمد کم ہے اور آورد و تصنع زیادہ"

---

[1] رسالہ اردو جون ۱۹۲۱ء

ایک نیا شگوفہ

ظہیر الدین احمد صاحب منیجر اردو مرکز لاہور نے بیان کیا کہ مئی ۱۹۵۰ء میں مولوی ابراہیم حنیف سابق پروفیسر الفنسٹن کالج دہلی نے دعوی کیا کہ موجودہ دیوانِ غالب مرزا غالب کا کلام و دیوان نہیں ان کا اصل دیوان اور ہے جس کو وہ اپنے پاس محفوظ بتاتے ہیں اور عنقریب شائع کرنے والے ہیں۔ اُس کے دیباچہ میں وہ اس کا بھی ثبوت پیش کریں گے کہ موجودہ دیوان مرزا کا دیوان نہیں ان پر اتہام ہے۔ رسالہ آجکل دہلی جون ۱۹۵۰ء میں نوادرِ غالب کے نام سے چند جدید خطوط اور کچھ اشعار طبع ہوئے ہیں۔

دیکھئے اردو کی بدقسمتی سے دنیا میں کب تک یہ غالب گردی قائم رہتی ہے اور کس کس رنگ میں جلوہ گر ہوتی ہے۔

کیفیتِ اصنافِ سخن

مرزا غالب کے دیوان میں تمام اصنافِ سخن نہیں جیسے مخمس، مسدس، مثلث وغیرہ، کچھ پوری کچھ ادھوری غزلیں ہیں۔ ان کی کیفیت تو لکھی جا چکی کچھ متفرق اشعار ہیں۔ اشعار و غزلیات میں ہائے ہو شراب و کباب کے مضامین ہیں سوز وگداز خوب ہے مگر زبان و بیان پیچیدہ اور پُر اغلاط ہے۔ قصیدے چار ہیں جن میں (۱۶۲) شعر ہیں قصائد میں زور شور شان و شکوہ نہیں۔ ایک مثنوی آموں کی تعریف میں ہے اس کے (۳۳) شعر ہیں۔ یہ کسی بڑے استاد کے شایانِ شان نہیں۔ مسٹر عطاء اللہ لکھتے ہیں۔[1]

"مگر خود غالب ہی کو مثنوی سے کیا علاقہ تھا"

---

[1] عالمگیر خاص نمبر نومبر ۱۹۴۳ء

نیاز فتحپوری لکھتے ہیں۔

"غالب[۱] مثنوی کے لئے وضع نہیں ہوا تھا"

قطعات میں (۱۱۱) شعر ہیں رباعیاں (۱۶) ہیں دو تاریخیں ہیں جن کے (۴) شعر ہیں یہ سب معمولی ہیں تمام دیوان میں ہر اشعار دو ہزار یا اس سے کچھ کم ہیں ان میں سے (۴۰۰) اشعار ایسے نکالے جا سکتے ہیں جن پر صحیح اردو شاعری کا اطلاق ہو سکتا ہے اور جو قابلِ تعریف قرار دیئے جا سکتے ہیں لیکن پروفیسر آزاد نے آبحیات میں ان کے صاف اشعار کے متعلق لکھا ہے۔

"اردو[۲] میں غالباً صاف اشعار کی تعداد سو دو سو شعر سے آگے نہ نکلے"

غالب کے دشمن

اس کے علاوہ کہ افراط و تفریط سے کام لینے میں علوم و فنون میں اغلاط کا فیوع ہوتا ہے جن سے علم و فن ملک و قوم سب کو نقصان پہنچتا ہے اس کے ردعمل کیلئے بھی لوگوں کو مدعو کرتا ہے۔ اس طرح دونوں طرف کی مبالغہ آمیزی اور شدت سے گمراہی کا طوفان بپا ہو جاتا ہے جو شخص کسی معمولی شخصیت کی مدح سرائی میں حد سے تجاوز کر جاتا ہے وہ ممدوح کا خطرناک دشمن ہے کیوں کہ اس کے اس عمل سے مخالفت کا پیدا ہونا ضروری ہے اس صورت میں جس طرح مدح میں بے اندازہ مبالغہ ہوا ہوگا۔ اس ہی طرح ذم میں بھی بیحد زیادتی ہوگی نتیجہ یہ ہوگا کہ اصل حقیقت پر گھپ اندھیرا چھا جائے گا اور گڑے مردے اکھڑ کر ایک بھلے مانس کی بدنامی کا سلسلہ قائم ہو جائے گا یہی صورت مرزا غالب کے ساتھ رونما ہوئی کہ ان کے مدحوں نے ان کو حکیم، فلسفی، منجم، صوفی، عالم و فاضل سب سے بڑا شاعر، سب سے بہتر ستار اور مجنوں و فرہاد کا استاد ثابت کرنے میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے ہیں۔

---

[۱] نگار جون ۳۵ء [۲] آبحیات نظم اردو کی تاریخ کا بیان

اور ان کے کلام میں طب وہیئت وغیرہ علوم کو پیدا کرنے کی سعی کی ہے نتیجہ یہ ہوا کہ کلامِ غالب معماین کر رہ گیا اور وہی ہوا کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی، اور مخالفت شروع ہوئی۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف نے غالب کے خلاف کتاب لکھی۔ ڈاکٹر صاحب نے اکثر معاملات پر معقولیت اور راستی کے ساتھ روشنی ڈالی مرزا یگانہ نے غالب شکن تصنیف کی یگانہ کا جو مقصد ہے صحیح ہے انھوں نے جو اعتراض کئے ان میں سے اکثر کا اٹھانا ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے لیکن انھوں نے اس شدت وسختی سے کام لیا ہے کہ جس کو گوارا نہیں کیا جا سکتا میں نے جب غالب شکن کو پڑھا تو دل پر سخت چوٹ لگی۔ مرزا غالب ایک محترم شخص تھے ان کے متعلق اس قسم کے الفاظ استعمال کرنا۔

"پرائے سرے کا یہ سرا بھی ہے پرانا چور اور چور کے ساتھ گونگا بھی ہے مضمون چرانے کو چرا تا ہے مگر ہضم نہیں کر سکتا۔"[۵]

کسی طرح مناسب نہ تھے غریب غالب نے نہ یہ کہیں لکھا ہے کہ میں سب سے بڑھ کر اور سب سے بہتر ہوں نہ کہیں ایسی وصیت کی ہے کہ لوگوں کو چاہیئے کہ میرے کلام پر ایمان لائیں نہ کہیں یہ دعویٰ کیا ہے کہ میرا کلام عیوب سے خالی ہے نہ کہیں یہ دعویٰ کیا ہے کہ میرے تمام مضامین میرے طبعزاد اور الہامی ہیں پھر غالب کو گالیاں دینا انصاف اور تہذیب کا خون کرنا ہے۔ اگر لوگوں نے غالب کو حد سے زیادہ بڑھایا ہے اور جس مرتبہ پر ان کو پہنچایا ہے وہ اس کے قابل نہیں تو اس میں غالب کی کیا خطا ہے غلطی ہے تو اُن لوگوں کی ہے جنھوں نے یہ افراط وتفریط پھیلائی ہے۔ مرزا یگانہ کو اُن لوگوں کی تردید وتکذیب کرنی تھی اگر کسی نے اس معاملہ میں ان کو چھیڑا تھا تو چھیڑنے والے کو صلواتیں سنائے غالب پر کیوں برس پڑے اور جس بنا پر انھوں نے غالب کو نقال اور چور کہا ہے اگر غور کیا جائے تو اردو کا کوئی شاعر بھی ان القابوں سے نہ بچ سکے گا۔

---

۵ غالب شکن مطبوعہ آرمی پریس دیال باغ آگرہ طبع ثانی ۱۹۳۵ء

مرزا یگانہ کی اس شدت وسختی کی ذمہ داری زیادہ تر غالب کے بیجا مدح کرنے والوں پر ہے کیوں کہ علوم وفنون میں اس قسم کی افراط وتفریط کو کسی طرح برداشت نہیں کیا جاسکتا اس لئے مرزا یگانہ اس معاملہ میں کسی قدر معذور بھی سمجھے جاسکتے ہیں۔لیکن غالب کے مدّاح کسی طرح برّی نہیں ہو سکتے کیونکہ غالب کی اس توہین کا باعث ان کی افراط وتفریط ہے۔مرزا یگانہ کا جو مقصد ہے صحیح ہے بیان میں شدت ضرور ہے لیکن انھوں نے دو ایک جگہ غالب شکن ہی میں مرزا غالب کی برمحل تعریف کر کے کچھ تلافی کر دی ہے جو ان کی حق پسندی اور سخن فہمی کا ثبوت ہے۔

مدعی سُست گواہ چُست

مرزا غالب اپنے اردو شاعری کے ہیچ ہونے کا خود اقرار کرتے ہیں ذوق کو مخاطب کر کے کہتے ہیں۔

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بہ گزر از مجموعہ اردو کہ بیرنگِ من است
راست می گویم من واز راست نتواں سر کشید
آنکہ در گفتار فخر تست آں ننگِ من است

اور بادشاہ کے حضور میں عرض کرتے ہیں۔

میں کون اور ریختہ ہاں اس سے مدعا
جز انبساطِ خاطرِ حضرت نہیں مجھے

لیکن ان کے مداح ان کو اردو کا خدائے سخن ثابت کرنے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں۔

"پیران نمی پرند و مریداں می پرانند"

مولانا الطاف حسین حالی پانی پتی اردو شاعری کے مصلحین میں سے ہیں انھوں نے مبالغہ وغیرہ کو ترک کرنے اور نیچرل شاعری کے اختیار کرنے کی بڑے

زور شور سے ہدایات کی ہیں لیکن یہ کس قدر افسوسناک امر ہے کہ جب وہ اپنے استاد مرزا غالب کے حالات لکھنے بیٹھے تو مبالغہ کی حدود سے بھی بہت آگے بڑھ گئے اور غالب کے کلام کے معانی و تشریح میں غیر موزوں مطالب کو داخل کر گئے۔ یادگارِ غالب پہلی کتاب ہے جس سے ادبِ اُردو میں عظیم الشان غلطیوں کی بنیاد قائم ہوئی ہے۔ سید ہاشمی فرید آبادی لکھتے ہیں۔

"یادگار غالب ہی وہ کتاب ہے جس نے جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں کلامِ غالب کو مقبول و مروج کیا۔"[۱]

صرف یہی نہیں کہ اشعار کو اپنی طرف سے معنی پہنائے بلکہ غالب کے بڑھانے کے لئے اور بھی کارستانیاں کی ہیں جن میں سے بعض کا ذکر آچکا ہے اور کچھ آگے مذکور ہوں گی۔ آغا محمد باقر حالی کی کتاب یادگارِ غالب کے متعلق لکھتے ہیں۔

"اگرچہ مولانا[۲] نے نہایت منصفانہ انداز سے اپنے استاد کے کلام پر تنقید کی ہے پھر بھی جوشِ عقیدت ان کو جادۂ انصاف سے کہیں کہیں ہٹا دیتا ہے۔"

لال قلعہ کی لوٹ

غریب ظفر بادشاہ کا تخت و تاج تو انگریزوں نے چھینا، مال و دولت کو نمک حراموں نے لوٹا بیچارے کے پاس ایک متاعِ سخن باقی تھی اس پر آزاد اور حالی نے دست درازی کی۔ اول آزاد نے ظفر کے قابلِ قدر کلام کو اٹھا کر ذوق کے بستے میں باندھ دیا جو کچھ باقی رہا تھا اس کی پوٹ باندھ کر حالی نے غالب کے سر پر رکھ دی۔ دونوں صاحبوں نے یہ بھی خیال نہ کیا کہ اہلِ نظر کیا کہیں گے کیا کوئی کہ سکتا ہے کہ جو رنگ ذوق و غالب کا ہے وہی ظفر کا ہے؟

---

[۱] رسالہ اردو اپریل سنہ ۱۹۲۲ء [۲] تاریخ نظم و نثر اردو صد ۲۴۳

نہیں تینوں کے رنگ علیحدہ علیحدہ ہیں۔ اگر ظفر کا کلام ذوق و غالب کا کہا ہوا ہوتا تو اس میں ان دونوں کا رنگ ہوتا مگر وہ دونوں سے نرالا طرز ہے اور ان حضرات نے یہ بھی نہ سوچا کہ ان کی اس کارستانی سے استاذ کے دامن پر کیسا بدنما دھبہ لگتا ہے۔ صاحبانِ فن یہ کہنے پر مجبور ہوں گے کہ یا تو بادشاہ ایسا غبی اور بے علم تھا کہ چار استادوں بیقرار، نصیر، ذوق اور غالب کے آگے زانوئے تلمذ طے کیا اور شعر کہنا نہ آیا یا استادوں ہی میں اتنی اہلیت اور قابلیت و قدرت نہ تھی کہ ایک شاگرد کو بھی نباہ سکیں ۔۔۔ مگر ظفر کا وہ کلام جو بہت قلیل ہے۔ باقی رہا جو زمانہ قیام رنگون کا ہے ۱۸۵۷ء کے بعد عرصہ دراز تک ظفر کا نام لینا بھی جرم تھا۔ اس لیے انگریزوں کے اس استبداد کی بدولت وہ کلام ظفر کے لیے بچ رہا۔ اگر یہ خوف نہ ہوتا تو عجب نہیں کہ اس کو آزاد یا حالی لپیٹ کر اپنی جیب میں ڈال لیتے۔ ظفر کے کلام میں جو دیوان شامل ہے سارے دیوان کا ایک ہی رنگ ہے ایک مسدس میں فرماتے ہیں۔

تجھ سے فریاد مرا تخت اٹھایا ہے خدا
بے خطا میرے تئیں آکے ستایا ہے خدا

یہ ایک غزل بہت مشہور ہے جس میں ۱۸۵۷ء کی بربادی کا حال ہے۔

کروں غم ستم کا میں کیا بیاں مرا کون حامی کار ہے
گئی یک بیک جو ہوا پلٹ نہیں دل کو میرے قرار ہے

یہ رعایا ہند تباہ ہوئی کہوں ان پہ کیا ہیں جفا ہوئی
جسے دیکھا حاکم وقت نے کہا یہ تو قابلِ دار ہے

ڈاکٹر بجنوری مرحوم[۱]

پروفیسر احمد الدین لکھتے ہیں۔

" نوجوانوں اور مغرب پسند طبقہ کو غالب کی طرف مائل کرنے والا پہلا شخص بجنوری مرحوم تھا۔"

پروفیسر صاحب کا یہ قول صحیح ہے اکثر اہلِ قلم نے یہی لکھا ہے مرحوم نے جوشِ عقیدت

---

۱ عبدالرحمٰن نام خان بہادر قاضی نور الاسلام کے فرزند تھے سیوہارہ ضلع بجنور کے مشہور خاندان قاضیان کے قابل ترین افراد میں سے تھے ابتدائی تعلیم وطن میں مولوی سید محمد ظفر معلم سے حاصل کی پھر کوئٹہ بلوچستان میں جہاں ان کے والد ماجد انجینیر تھے ہائی اسکول میں داخل ہو گئے وہاں سے انٹرنس پاس کر کے محمڈن کالج علی گڑھ میں داخل ہوئے یہاں ان کی جماعت میں کئی عبدالرحمٰن تھے اس لئے ضرورت ہوئی کہ شناخت کے لئے لقب تجویز کئے جائیں۔ ایک صاحب عبدالرحمٰن سندھی مشہور ہوئے (پھر صدیقی کہلائے گئے)، ایک عبدالرحمٰن بلوچی مشہور ہوئے ان کا لقب ضلع کی نسبت سے بجنوری ہوا۔ علی گڑھ سے ایل ایل بی کرنے کے بعد یورپ میں بیرسٹری وغیرہ کی تعلیم حاصل کی۔ یورپ سے واپسی پر مراد آباد میں وکالت شروع کی پھر ریاست بھوپال میں مشیر تعلیم مقرر ہوئے تھوڑے عرصہ کے بعد بھری جوانی میں وہیں عازمِ فردوس ہوئے۔ ان کی اہلیہ ان سے ایک ہفتہ قبل وفات پا چکی تھیں۔ مرحوم نے دو لڑکیاں اور ایک لڑکا چھوڑا ایک لڑکی شادی کے بعد لاولد فوت ہوئی دوسری لڑکی صاحبِ اولاد موجود ہے۔ لڑکا محمد فاتح فرخ تھا جس نے مسلم یونیورسٹی سے ایل ایل بی کیا مراد آباد میں وکالت کی مرحوم نے جرمن زبان میں ایک کتاب فقہ اسلام پر تصنیف کی تھی اردو میں محاسنِ کلام غالب لکھی مرحوم کے صاحبزادے نے ان کے متفرق مضامین و خطوط کو (باقی حاشیہ ۱۴۷ پر ملاحظہ ہو)

میں اپنے زورِ علم سے غالب کے کلام میں وہ وہ نکات پیدا کر دیئے جو کسی کے خیال میں بھی مشکل سے آسکتے ہیں لیکن مبصرین پر منکشف ہو گیا ہے کہ ان مطالب و نکات کو غالب کے کلام سے دور کا بھی واسطہ نہیں اور یہ سعی لاحاصل ہے اکثر مبصرین نے محاسنِ کلامِ غالب کے متعلق اسی ہی قسم کی رائے کا اظہار کیا ہے ایسی عقیدت مندانہ کوشش سے ہر شاعر کے کلام میں اس قسم کے کیا ان سے بہتر نکات پیدا کئے جا سکتے ہیں لیکن اس زورآزمائی سے کچھ فائدہ نہیں مضرت ہی ہے۔ شیخ محمد اکرم ایم اے۔ ایم آر سی اے ایس آئی سی لکھتے ہیں۔[۱]

"بد قسمتی سے ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری اس میں (محاسن کلامِ غالب میں) کئی فقرے ایسے لکھ گئے ہیں جو حقیقت سے زیادہ عقیدت پر مبنی ہیں اور انھوں نے کئی اشعار کو ایسے معنی پہنائے ہیں جو شاعر کے خیال میں نہیں ہو سکتے۔"

مظفر شاہ خاں صاحب ایم اے لکھتے ہیں۔[۲]

"مرزا غالب کے تغزل اور ان کی رفعتِ تخیل سے مرعوب ہو کر خواہ ڈاکٹر بجنوری کی طرح غالب کی شاعری اور دیوان کو ہندوستان کی الہامی کتاب کہہ دیا جائے لیکن اربابِ نظر جانتے ہیں کہ مدحیہ الفاظ کی بلند آہنگیاں حقیقت پر پردہ نہیں ڈال سکتیں خود ڈاکٹر بجنوری نے

(ص ۱۴۶ کا باقی مضمون) بصورت کتاب از نام باقیاتِ بجنوری شائع کرایا۔ اس کتاب کی دوسری جلد زیرِ الطبع ہے مرحوم ۱۸۸۵ء میں سیوہارہ میں پیدا ہوئے ۱۹۱۸ء میں بھوپال میں وفات پائی راقم بسطور کے خاندان سے تھے باہم چند رشتے تھے قریب تر رشتہ یہ تھا کہ میرے رشتے میں ہمشیرہ زادے تھے۔ مرحوم سعید الفطرت طباع ذہین و ذی علم نوجوان تھے۔ آہ [۱] رسالہ ہمایوں لاہور
[۱] آثار غالب ص ۱۸۷ مرکنٹائل پریس لاہور [۲] رسالہ برہان دہلی جنوری ۱۹۴۸ء

محاسنِ کلامِ غالب میں غالب کے منتخب اشعار کو بعض اہم فلسفیانہ مباحث کے ساتھ منطبق کیا ہے لیکن ان اشعار میں بھی زیادہ شعر وہی ہیں جن میں تغزل کی روح کا فقدان ہے بلکہ وہ صرف عامۃ الورود اخلاق یا حکمیہ خیالات ہیں۔"

حق برزبان جاری

بجنوری مرحوم کے قلم سے محاسنِ کلامِ غالب میں اول یہ فقرہ نکلا ہے کہ ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں ایک وید مقدس دوسرے دیوانِ غالب۔ مرحوم کا یہ قول صحیح ہے وید مقدس کو بھی آج تک کوئی نہ سمجھ سکا دیوانِ غالب کو بھی کوئی نہ سمجھ سکا جس طرح وید کے اکثر منتروں کے ترجمے اور تفسیریں مترجمین وشارحین میں زمین و آسمان کا اختلاف ہے ایسا ہی دیوانِ غالب کے اشعار کے متعلق ہے۔

حالی وبجنوری پر مبصرین کی رائیں

ان دونوں فاضلوں کے مساعی پر اہلِ بصیرت نے حسبِ ذیل خیالات کا اظہار کیا ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللطیف لکھتے ہیں۔

"؎ حالی اور بجنوری غالب کے سمجھنے میں اپنے علم و فضل کو تو خوب سمجھا گئے لیکن خود غالب کے کمال کی تصویر نہ کھینچ سکے ۔۔۔ محاسن کے مطالعہ سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ان کی قوتِ فیصلہ کمالِ جوشِ عقیدت کا شکار ہو گئی بھلا وہ نقاد پڑھنے والے

؎ غالب مصنفہ عبداللطیف ص ۲، ۳، ۵ و ۱۱

کے دل میں کیا اعتماد پیدا کر سکتا ہے جو اپنی کتاب کا آغاز اس حیرت انگیز قول سے کرتا ہے کہ ہندوستان کی دو الہامی کتابیں ہیں۔ وید مقدس اور دیوان غالب۔ اس طرح کے قول فیصل سے فوراً یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ نقاد کو اصول کا کوئی احترام نہیں ـــــ حالی کی یادگار غالب گو نسبتاً ضخیم ہے لیکن اس میں ادعائی شان کم پائی جاتی ہے۔ بجنوری کی طرح وہ ڈرامہ نویسوں، مزاحیہ نگاروں اور فلسفیوں کی خدمت میں دیوانہ وار نہیں بھٹکتے بلکہ ایک خاص قابل فہم مسلک اختیار کر سکتے ہیں ـــــ حالی و بجنوری دونوں کے طرز تنقید میں ایک بڑا عیب یہ ہے کہ ایک آدھ شعر سے وہ یہ نتیجہ نکال لیتے ہیں کہ غالب ہیئت داں اور فلسفی، واعظ عاشق سب ہی کچھ تھا۔"

مجلہ طیلسانیان حیدرآباد دکن میں ایک اہل قلم نقاد لکھتے ہیں۔

"وہ[۱] مرحوم بجنوری ہی تھے جن کی وجہ سے عصر حاضر میں غالب کو دنیائے سخن کا ایک نامور تاجدار سمجھا گیا ہے مرحوم کی دانست میں ہندوستان کی دو الہامی کتابیں ہیں جن میں ایک دیوان غالب ہے مرحوم نے اپنی کتاب محاسن کلام غالب میں غالب کے متعلق نہایت افراط سے کام لیا ہے اور اس کی تعریف میں بڑی حد تک مبالغہ کو جگہ دی ہے۔

پروفیسر کلیم الدین احمد بی اے کینٹب لکھتے ہیں[۲]۔

"پہلی مثال عبدالرحمٰن بجنوری کی ہے اپنے مقدمہ میں لکھتے ہیں تنازع للبقاء سے مغلوب ہو کر ایشیائی ایسے مرعوب ہو گئے ہیں کہ اپنے ہر فعل و خیال کا موازنہ مغربی اقوام اور آراء سے کرنے لگے ہیں یہ وہ غلامی ہے

---

[۱] مارچ ۱۹۴۳ء [۲] اردو تنقید پر ایک نظر مطبوعہ بانکی پور ص ۱۶۱، ۱۶۴، ۱۴۹

جس کی زنجیروں کو تلوار بھی نہیں کاٹ سکتی ہیں کیا تعجب ہے اگر اس یورپ زدگی کے زمانہ میں طالب علم اور انگریزی تعلیم یافتہ مرزا غالب شیکسپیر ورڈزورتھ اور ٹینی سن سے مقابلہ کرتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں افسوس یہ کوتاہ نظر نہیں جانتے کہ شاعری اور تنقید پر کیا دانستہ ظلم ہوتا ہے اس کے بعد وہ خود بھی اپنی یورپ زدگی کا ثبوت دیتے ہیں اور اس کوتاہ نظری کے مرتکب ہو کر شاعری تنقید، حقیقت و مذاقِ سلیم پر دانستہ ظلم کرتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ انگریزی شعراء کے بدلے غالب کا جرمن شعراء سے مقابلہ کرتے ہیں دنیا میں اگر کسی شاعر سے غالب کا مقابلہ ہو سکتا ہے تو وہ شعرائے المانیہ کا سرتاج یوحنا ولف گا تک گیٹے ہے صرف یہی نہیں وہ قدم قدم پر مغربی شاعروں فیلسوفوں صناعوں انشا پردازوں کا نام لیتے ہیں ان کے اقوال و آراء نقل کرتے ہیں غالب کا ان سے مقابلہ کرتے ہیں اور اس طرح اپنی یورپ زدگی کو پایۂ ثبوت تک پہنچا دیتے ہیں اور اس سلسلے میں آسمان و زمین کے قلابے ملا دیتے ہیں اس مقدمہ میں بجنوری مرحوم جتنی غلط فہمیوں بے سرو پا باتوں کے مرتکب ہوئے ہیں ان کی تفصیل کے لئے ایک عمر چاہیئے۔

بجنوری مرحوم جوشِ عقیدت اور جذبۂ وطنیت سے مجبور ہو کر اس قسم کی غلطی کے مرتکب ہوئے ہیں جسے دیکھ کر انگشت بدنداں ہونا پڑتا ہے غالب کی شاعری کے محاسن سے انکار نہیں لیکن غالب کا گیٹے سے مقابلہ کرنا تنقید ہی نہیں بلکہ فہم پر دانستہ ظلم کرنا ہے لیکن بجنوری مرحوم اس پر اکتفا نہیں کرتے شاعری کے جتنے محاسن مغربی انشاء پردازوں اور فن کاروں نے گنائے ہیں انھیں وہ ڈھونڈ کر غالب کے اشعار میں نکالتے ہیں اور انھیں اس کا ذرا بھی

احساس نہیں ہوتا کہ ان کی یہ کوشش ناکامیاب ہی نہیں مضحک بھی ہے ۔۔۔ جہاں بجنوری مرحوم مبہم اور غیر معین پیرایہ سے کنارہ کش ہو کر غالب اور کسی مغربی شاعر یا صناع یا غالب کے کسی شعر اور کسی مغربی نظم کا مقابلہ کرتے ہیں تو ان کی کم نظری آشکارا ہو جاتی ہے ۔ وہ غالب کے اشعار میں اپنے معانی داخل کرتے تھے ۔

نیاز فتحپوری لکھتے ہیں[1] :۔

"اگر آج وہ (بجنوری مرحوم) زندہ ہوتے تو غالب کی مدح سرائی کی وہ صورت جو ایک ذم کا پہلو لیئے ہوئے ہے کبھی اختیار نہ کرتے ۔۔ غالب کے شاعر ہونے میں کس کو گفتگو ہو سکتی ہے لیکن اس کے محاسن شاعری کا اس لیئے قابل ہونا کہ اس نے حکمت ، فلسفہ کے تمام نکات حل کر دیئے ہیں نہ صرف خلافِ حقیقت و واقعہ ہے بلکہ میرے نزدیک غالب کی شاعری کی توہین بھی ہے ۔ غالب کی شاعری کا وہی حصہ بیکار ہے جسے وہ فلسفہ طرازی سے تعبیر کرتے ہیں ۔"

غالب کے مداح

محاسنِ کلامِ غالب کا شائع ہونا تھا کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں بھیڑ اچال کا سمندر موجزن ہو گیا اور غالب پر کتابیں اور مضامین شائع ہونے لگے ۔ چھٹے ساتویں درجہ میں تعلیم پانے والے لڑکوں نے بھی غالب پر مضامین لکھے اور غالب ایک فیشن قرار پا گیا لیکن کسی مضمون نگار نے حالی و بجنوری کی تقلید سے سرِ مو انحراف نہیں کیا اور نہ کسی کو نکتہ چینی کی جرائت ہوئی نہ کسی نے تحقیق و تنقید کی تکلیف گوارا کی ایک سے بڑھ کر ایک ، نے زمین و آسمان

---

[1] مجموعہ استفسارات و جواب حصہ دوم صـ۲۲ـ ۱۹۳۶ء

کے قلابے ملانے کی کوشش کی ہوا کا رخ دیکھ کر اس سیلِ رو میں بعض بڑے بڑے بھی بہ گئے ہیں، اور بعض نے اس کو حصولِ زر کا ذریعہ ٹھہرایا اور خوب کمایا۔ ڈاکٹر عبداللطیف لکھتے ہیں۔

"جس[1] قدر کہ جدید علمی مراکز میں اردو ادب کی تحقیق و تدقیق سے بے پروائی برتی جاتی ہے اور معلم و متعلم زیادہ تر اوروں (حالی و بجنوری) کے پڑھائے سبق کو دہراتے رہتے ہیں"

حکیم ابو عزیز غلام غوث لکھتے ہیں۔

"جن[2] کے اشعار لاحل کو بمنزلہ معجزہ پیش کیا جاتا ہے"

بعض وہ لوگ کہ جن کو معمولی طور پر شعر خوانی کا ذوق ہے اس امر سے بھی مرعوب ہیں کہ مرزا کے متعلق بہت سی کتابیں اور مضامین شائع ہوئے ہیں اصل حقیقت تک ان کے ذہن کی رسائی نہیں۔

دیوانِ غالب کے شارح اور شرحیں

غالب پرستی کی وبا جب عام ہوئی تو بعض مشاہیر نے خدا جانے کس خیال سے دیوانِ غالب کی شرحیں لکھیں وہ غالب اور حالی اور بجنوری سے ایسے مرعوب ہوئے کہ حقیقت سے چشم پوشی کرتے ہوئے ان سے زیادہ نکات سازی میں مصروف ہو گئے اور فرضی معانی و مطالب سے ضخیم شرحیں طیار کر دیں جو رعب ان کے دلوں پر بیٹھ گیا تھا اس نے ان میں کما حقہٗ اظہارِ حقیقت کی جرأت پیدا نہ ہونے دی۔ آغا محمد باقر لکھتے ہیں۔

"میں[3] غالب پر تخریبی نکتہ چینی کرنا سوئے ادبی خیال کرتا ہوں اس لئے میں نے عمداً اس سے گریز کیا ہے"

---

[1] غالب مصنفہ عبداللطیف ص۱۱ [2] شباب اردو مئی ۱۹۲۱ء [3] بیانِ غالب ص۲

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ آغا صاحب تخریب و تنقید کے معنی اور فرق پر نظر نہیں رکھتے تخریبی نکتہ چینی سوئے ادبی نہیں بلکہ بے ایمانی ہے اور تنقید کرنا بشرطِ تہذیب سوئے ادبی نہیں بلکہ مستحسن ہے جو کتابیں ایسی عقیدت سے لکھی جائیں گی وہ نقادانِ فن کی نظروں میں کیوں کر قابلِ اعتماد قرار پائیں گی اور علم و ادب کے لئے کس طرح مضرت رساں نہ ہوں گی۔ اغلاط کا اخفا اور ان کو محاسن کا جامہ پہنانا جرم ہے اور مضرت کو عام کر دینا ہے۔ دیوانِ غالب کی شرحوں اور شارحوں کے متعلق پروفیسر حامد حسن قادری لکھتے ہیں۔

"جو[1] لوگ ان سے مرعوب ہو گئے تھے انھوں نے کلامِ غالب کو ایک حدیث اور الہام سمجھ کر معنی پہنانا شروع کر دیئے ـــ غالب کو سمجھنے اور سمجھانے والوں نے اکثر بے سمجھے تعریفیں کرنی اور شرحیں لکھنے کی کوشش کی ــــ

"اتفاق سے عبدالباری صاحب آسی لکھنوی کی شرح دیکھنے کو مل گئی اس کا نام مکمل شرح دیوان غالب مترمیم شدہ ہے کئی سال ہوئے اس شرح کے متعلق مولوی عبدالحق صاحب دہلوی کی تنقید دیکھی تھی انھوں نے آسی صاحب کے بعض عجیب و غریب مطالب کے نمونے دیئے تھے ــ آسی صاحب کی سخن فہمی کی وہ وہ کرامتیں درج ہیں کہ میں اس مضمون کے لکھنے پر مجبور ہو گیا۔

اشعار کے مطالب میں کہیں طول لاطائل اور کہیں اختصار نامناسب ہے بعض اشعار کے مطالب میں طویل مباحث کرتے ہیں کہیں کہیں پانچ پانچ صفحے ان باتوں سے بھر گئے ہیں اور ان میں سے اکثر مطالب غیر ضروری ہیں۔

---

[1] نقد و نظر مطبوعہ آگرہ ۱۹۴۳ء ص ۱۶، ۱۷، ۳۰، ۳۲، ۳۶، ۳۹، ۴۹

نظم صاحب نے بھی ادھر ادھر کی غیر ضروری باتوں سے اپنی کتاب شرحِ دیوانِ غالب کو طول دے دیا ہے کہیں مذہبی مسائل بیان کئے ہیں کہیں عرب کی شاعری پر بحث کی ہے کہیں دہلی اور لکھنؤ کی زبان کا مسئلہ چھیڑ دیا ہے کہیں لطیفوں پر لطیفے لکھ دیئے ہیں ایک جگہ غالب کے اس مصرعہ (ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے) پر ڈیڑھ درجن مصرعے اپنے چسپاں کر دیئے ہیں جس میں سے ہر ایک مصرعہ خواجہ وزیر اور آغا امانت کی ارواح پر فاتحہ خوانی کر رہا ہے اس سلسلہ میں ایک اور مصرعہ (اس لئے تصویر جاناں ہم نے کھچوائی نہیں) پر اکیس مصرعے لگا دیئے ہیں اور یہ بھی لکھنؤ اسکول کا فوٹو گروپ ہی ہے۔

آغا صاحب کا طول لاطائل ہے حسرت صاحب نے شوقِ اختصار میں بہت سے قابلِ تشریح اشعار ویسے ہی چھوڑ دیئے ہیں۔ لیکن سب شارحین میں یہ عجیب بات ہے کہ کوئی صاحب نقد و نظر سے کام نہیں لیتے شرحِ دیوانِ غالب ایک طوفان ہے جس میں ضرورت منڈ ڈبکیاں کھا رہے ہیں۔

مسٹر تاثیر ایم اے لکھتے ہیں۔

"میں نے مختصر فنِ تنقید اور شاعری کے متعلق ان چند مبادیات کا اعادہ اس لئے کیا کہ شارحینِ غالب بالعموم ان کے کلیتاً نا آشنا ہیں۔

آپ (طباطبائی) جابجا غلط معانی لکھتے جاتے ہیں — سب سے زیادہ مضحکہ انگیز وہ حصے ہیں جہاں آپ غالب کو چھوڑ کر اپنے ادبی کارنامے بیان کرنے شروع کر دیتے ہیں — (ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے

---

۵۷ رسالہ نیرنگِ خیال لاہور جولائی ۲۶ء

قلم ہوئے) اس میں پانچ صفحوں میں اپنی گرہ بندی کے کارنامے گنوائے ہیں بے تعلق باتوں میں صفحے کے صفحے سیاہ کئے چلے جاتے ہیں مگر جہاں کہیں غیر مانوس لفظ کی تشریح درکار ہوتی ہے طرح دے جاتے ہیں۔ میرا شرح طبا طبائی پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ وہ کسی طرح شرح کہلانے کی مستحق نہیں ہے"

سید ہاشمی فرید آبادی لکھتے ہیں۔

"لیکن ان کی (طبا طبائی کی) شرح میں جا بجا غیر متعلق مباحث نظر آتے ہیں۔ متعدد مقامات پر صفحے کے صفحے ان مضامین سے بھرے ہوئے ہیں جن کا شعر کی شرح سے براہِ راست کوئی تعلق معلوم نہیں ہوتا۔

ڈاکٹر زور لکھتے ہیں۔

"غالب کی شاعری کے سمجھنے سمجھانے کی بیسیوں کوششیں کی گئیں اور ہر شارح نے اپنی اپنی بساط کے مطابق مرزا کے اردو دیوان کی شرح لکھی"

قاضی عبد الغفار صاحب لکھتے ہیں۔

"دیوانِ غالب کی اتنی شرحیں لکھی گئیں کہ ناقدین کے دریائے افکار کا میلا پانی بہتا چلا گیا"

شارحین کے متعلق اربابِ بصیرت نے حسب ذیل شکایات کی ہیں ایک یہ کہ نقد و نظر سے کام نہیں لیتے دوسرے یہ کہ غیر متعلق مباحث میں طول دیتے ہیں تیسرے یہ کہ نامانوس الفاظ کو چھوڑ دیتے ہیں میں عرض کرتا ہوں کہ اگر نقد و نظر سے کام لیں تو کتاب ناقابلِ شرح ٹھہرے طول لاطایل نہ کریں تو کتاب ضخیم کیوں کر

---

(۱) رسالہ اردو اورنگ آباد دکن اپریل ۱۹۴۲ء (۲) سرگزشتِ غالب ص ۱۲ ابراہیمیہ پریس حیدرآباد دکن ۱۹۳۹ء (۳) رسالہ ایشیا بمبئی مارچ ۱۹۴۲ء۔

طیار ہو جس سے رعب قائم ہو نامانوس الفاظ کی شرح کو چھوڑیں تو کیا شرح کریں کوئی مطلب قابلِ شرح پیدا ہو تو کچھ لکھیں۔

جتنے منہ اتنی ہی باتیں

دیوانِ غالب کی ایک درجن سے زیادہ شرحیں لکھی گئی ہیں اور مختلف اشعار کی شرحیں جو مضامین رسایل و اخبارات میں شائع ہوئے ہیں ان کا شمار کون بتا سکتا ہے۔ ان شرحوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر شارح کے ذہنِ رسا نے علیحدہ ہی راستہ اختیار کیا ہے۔ شارحین دیوانِ غالب کے متعلق شوکت تھانوی نے صحیح لکھا ہے۔[1]

"دوسرے کو غلط اپنے کو صحیح کہتے ہوئے ایک درجن کے قریب شارح اپنی اپنی شرحیں لئے اسٹیج پر آگئے نتیجہ یہ ہوا کہ کلامِ غالب معما ہو کر رہ گیا"

ہر قابلیت کا آدمی ایک نئی شرح اور معنی تجویز کرے ہر شارح دوسرے سے موافقت نہ کرے یہ صورت سوائے ہمارے کے اور کہیں نہیں ہو سکتی وہ لوگ جن کو مضمون لکھنے کا شوق ہے اور جو ادبی مضمون نگاروں کی فہرست میں اپنا نام درج کرانا چاہتے ہیں لیکن نہ عربی جانتے ہیں نہ فارسی نہ عروض و مصطلحات نہ اردو زبان اور شاعری کی تاریخ سے پوری واقفیت رکھتے ہیں۔ اساتذہ کے کلام پر بھی ان کو عبور نہیں ان کے لئے ادیب مشہور ہونے کا اس سے بہتر کوئی موقع نہیں کہ غالب پر مضمون لکھیں۔ غالب کے اشعار کی شرح کریں اور جو کچھ اسکول میں انھوں نے ہیئت و فلسفہ وغیرہ کے ادھورے مسائل کتب نصاب میں سے رٹ لئے ہیں ان کو کھینچ تان کر غالب کے سر مڑھیں۔ شارحین کی اس حالت و کثرت پر شوکت تھانوی

---

[1] شرح دیوانِ غالب شوکت تھانوی

نے خوب لکھا ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ جب دو اجنبی آپس میں ملاقات کرتے ہیں تو ایک دوسرے سے پوچھتا ہے کہ آپ شارح دیوانِ غالب تو نہیں ہیں اگر وہ اثبات میں جواب دیتا ہے تو سامع دوڑ کر بھاگ جاتا ہے اور اپنے گھر کا دروازہ بند کر لیتا ہے۔

یہ گنجائش کلام ہی بس تھی کہ شوکت تھانوی کو مزاحیہ شرح لکھنے کا موقع ہاتھ آگیا۔ مرزا واجد حسین لکھتے ہیں۔

"مختلف[۵۹] شارحین نے مختلف معنی بتائے ہیں مگر سب کا ذہن ایک مرکز پر نہیں ٹھہرتا (ایک شعر کی شرح کو پیش کر کے لکھتے ہیں) اب انصاف سے دیکھئے اس ایک شعر کی شرح میں شارحین کا ذہن کدھر کدھر کو بھٹک رہا ہے کوئی نتیجہ واحد نہیں نکلتا یہ اختلافِ معنی اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ شعر میں اتنی صلاحیت ہی نہیں کہ مختلف ذہنوں کو نتیجۂ واحد اور مشترک تک پہنچا سکے۔"

غرض مرزا غالب کا کلام آتش کے اس شعر کا صحیح مصداق ہے۔

سمجھ لیتے ہیں مطلب اپنے اپنے طور پر سامع
غزل آتش کی رکھتی ہے اثر مجذوب کی بڑ کا

شارحین کے اختلاف کا کچھ نمونہ

بعض اوقات ایک کلام کی شرح میں مختلف اقوال ہوتے ہیں لیکن سب کا مرکز مقصد واحد ہوتا ہے ایسا اختلاف نہیں ہوتا کہ ایک آسمان کی کہے تو دوسرا زمین کی اور شارح ایسی ایسی عجیب باتیں نکالیں جو کسی طرح خیال میں نہ آئیں اور متن بھی اس کا حامل نہ ہو مثلاً

---

۵۹ شباب اردو اگست ۱۹۲۹ء

دل وجگر میں پرافشاں جو موجۂ خوں ہے
ہم اپنے زعم میں سمجھے ہوئے تھے دم آگے

اس کی شرح میں طباطبائی نے جو عجیب و غریب بحثیں کی ہیں ان پر پروفیسر حامد نے اپنی کتاب نقد و نظر کے ص۴۲ پر بہت ہی اظہارِ تعجب کیا ہے۔

موت کی راہ نہ دیکھوں کہ بن آئے نہ رہے
تم کو چاہوں کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے

بیانِ غالب کے صفحات ۴۳، ۴۴، ۴۵ پر اس شعر کی شرح کے اختلافات قابلِ دید ہیں۔

وعدۂ سیرِ گلستاں ہے خوشا طالعِ شوق
مژدۂ وصل مقدر ہے جو مذکور نہیں

بیخود اور آسی کی شرح علیحدہ علیحدہ ہے۔ پروفیسر حامد حسن دونوں کو غلط بتاتے ہیں اور لوگ دو ہی معنی تجویز کرتے ہیں۔

رنج وہ کیوں کھینچیے واماندگی کو عشق ہے
اٹھ نہیں سکتا ہمارا جو قدم منزل میں ہے

اس شعر کی شرح میں شارحین کا اختلاف ایک عجیب و غریب تماشہ ہے۔

اپنے کو دیکھتا نہیں ذوقِ ستم تو دیکھ
آئینہ تاکہ دیدۂ نخچیر سے نہ ہو

طباطبائی لکھتے ہیں جب تک چشمِ نخچیر کا آئینہ نہ ہو وہ ستمگر آرائش نہیں کرتا اور اپنا منہ نہیں دیکھتا آسی لکھتے ہیں اس کو ذوقِ ستم اتنا ہے کہ خود آرائی کو بھی اس کے آگے ہیچ سمجھتا ہے۔

عجیب اختلاف

شارحین میں اختلاف ہوتا ہے لیکن سب بنی شرح اور دلائل سے

ایک ہی مقصد کی طرف کو رجوع ہوتے ہیں۔ مرزا غالب کے شارحین میں ایک عجیب وغریب بات ہے کہ مرزا نے اپنے بعض اشعار کی شرح خود اپنے خطوط میں کی ہے لیکن مرزا کے مداح اُس سے اختلاف کر رہے ہیں اور دوسرا مطلب لگا رہے ہیں مصنف کے بیان سے اختلاف یہ عجیب تماشا ہے۔

کوئی دن گر زندگانی اور ہے
ہم نے اپنے جی میں ٹھانی اور ہے

بیخود شرح لکھتے ہیں۔

"اب[1] تک تو ہم نے تمھاری التجائیں غیروں کی منتیں کیں اور راہ عشق کی ٹھوکریں کھائیں مگر اب ہم نے اپنے دل میں ٹھان لی ہے کہ تم سے ترک تعلق کر کے ایک گوشہ میں بیٹھ جائیں گے اگر عشق کامل اور جذبہ صادق رکھتے ہیں تو تم خود ہمیں پوچھتے ہوئے ہمارے گھر چلے آؤ گے مگر یہ ساری باتیں اس صورت میں ہو سکتی ہیں کہ ہماری زندگی بھی وفا کرے اور غمِ فراق ہماری جان پر نہ بنا دے۔"

مرزا غالب اپنے ایک خط میں اس کی شرح اس طرح لکھتے ہیں۔

"شاعر[2] اپنا مقصود کیوں بتائے کہ میں کیا کر دوں گا ہم کہتا ہے کہ میں کچھ کروں گا خدا جانے شہر یا نواحِ شہر میں تکیہ بنا کر فقیر ہو کر بیٹھ رہے یا دیس چھوڑ پردیس کو چلا جائے۔

یہ اصل مصنف اور شارح کا اختلاف ہے مصنف نے جو مطلب لکھا ہے وہ ضرور شعر سے تعلق رکھتا ہے بیخود صاحب کا مطلب شعر سے حاصل نہیں ہوتا۔

متقابل ہے مقابل میرا
رک گیا دیکھ روانی میری

---

[1] مرآۃ الغالب ص۲۰ [2] بیانِ غالب ص۴

حسرت صاحب نے اس کی شرح یہ لکھی ہے۔

"کہ حریف میری روانی (روانیٔ طبع) کو دیکھ کر درحقیقت قائل ہوگیا لیکن ظاہر میں محض بات کی پچ کے لئے یہ تصنیع مقابلہ کئے جاتا ہے"

اس شرح سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مرزا نے یہ شعر کسی اپنے مدمقابل شاعر کے لئے کہا ہے۔ مرزا اس کی اپنے خط میں اس طرح شرح لکھتے ہیں۔[۱]

"تقابل، وتضاد کو کون نہ جانے گا نور و ظلمت، شادی و غم، راحت و رنج، وجود و عدم، لفظ تقابل اس مصرعہ میں بمعنی مرجع ہے جیسے کہ حریف کہ بمعنی دوست بھی مستعمل ہے مفہوم شعر یہ ہے کہ ہم اور وہ دوست از روئے خود عادات ضد ہم دیگر ہیں اور وہ میری طبع کی روانی دیکھ کر رک گیا"

حسرت کی شرح مرقومہ بالا کو لکھ کر آغا محمد باقر لکھتے ہیں۔

"راقم نے اس شعر کے یہ معنی لکھے تھے بعد میں مرزا کی شرح نظر سے گزری"

اس فقرے سے یہ ثابت ہے کہ آغا صاحب کے نزدیک حسرت کی شرح مرزا کے مقصد کے خلاف ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ شعر کے الفاظ حسرت کی شرح کی تائید کرتے ہیں۔ اور مرزا نے وہی مفہوم باندھا ہے جو خود لکھا ہے لیکن اس کو ادا کرنے پر قادر نہ ہو سکے۔

عجیب عجیب شرحیں

مرزا غالب کے مداحوں دیوان غالب کے شارحوں نے یہ غضب ڈھایا ہے

---

[۱] بیانِ غالب صفحہ ۳۰۸ بحوالہ عود ہندی۔

کہ تمام علوم و فنون کا جو پہلے سے چلے آتے تھے اور جو غالب کے بعد ظاہر ہوئے غالب کو مالک و ماہر ثابت کرنے کی سعی کی ہے گویا جو علوم و ایجادات ہونے والے تھے وہ غالب کو پہلے ہی سے معلوم تھے اس کوشش میں انھوں نے اشعار کی عجیب عجیب شرح کی ہے۔

(۱) ضعف سے گریہ مبدل بدمِ سرد ہوا

باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

اس شعر سے استحالۂ عناصر کے مسئلہ کو ثابت کر کے غالب کو بڑا سائنس داں ٹھہرایا ہے۔ اس قسم کے اشارات سے اگر ایسے نتائج نکالے جائیں تو دیوانِ غالب کیا دیوانِ چرکین بھی علوم و فنون کا مخزن ثابت ہو جائے گا۔ ان لوگوں کو یہ بھی خبر نہیں کہ اس مضمون کو غالب سے بہت پہلے ناسخ ادا کر چکے ہیں۔

اشک تھم جائیں جو فرقت میں تو آہیں نکلیں

خشک ہو جائے جو پانی تو ہوا پیدا ہو

مرزا غالب کے مرقومہ بالا شعر کی تشریح کے متعلق مسٹر احمد الدین ایم اے سابق محقق تاریخ الٰہ آباد یونیورسٹی لکھتے ہیں۔[1]

"جن بودے دلائل سے اس نے استحالۂ عناصر ثابت کیا ہے وہ اس کی سائنس دانی کے متعلق اچھا خیال پیدا ہونے نہیں دیتا ہماری رائے میں غالب کو بڑا سائنس داں ثابت کرتے ہیں۔ فاضل مقالہ نگار نے بھی وہی غلطی کی ہے جو ڈاکٹر بجنوری مرحوم نے غالب کو تمام قدیم و جدید علوم کے ماہر ثابت کرنے میں کی ہے۔ غالب کے متعلق بجنوری مرحوم کا حد سے بڑھا ہوا جوش جس تحریر پر منتج ہوا افسوس کہ وہ اس لحاظ سے ایک سعی نامشکور ہے۔"

---

[1] رسالہ ہمایوں لاہور اکتوبر ۱۹۳۵ء

اگر اس طرح کی تنگ بندیوں سے کام لیا جائے تو پھر کوئی شاعر بھی گزشتہ اور آیندہ علوم و فنون سے بے خبر نہیں قرار پا سکتا بلکہ غالب سے پہلے جو اساتذہ گزرے ہیں ان کے کلام سے غالب کے کلام کے مقابلہ میں زیادہ علوم کی نشان دہی کی جا سکتی ہے مثلاً

یوں بانہ اخذِ نور سے ہم کو رکھے ہے جسم
جیسے خسوفِ ماہ کو حایل زمین ہے

یہ سودا کا شعر ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سودا مسائل حکمت و فلسفہ و ہیئت و تصوف کا ماہر تھا اس شعر میں حکمت و فلسفہ کے کئی مسائل موجود ہیں۔

(۱) گرہن کا باعث، آفتاب و ماہتاب کے درمیان کرۂ ارض کا حائل ہونا ہے (۲) تعلقاتِ دنیوی تزکیۂ نفس میں خارج ہوتے ہیں (۳) چاند منور بالذات نہیں بلکہ آفتاب سے اخذِ نور کرتا ہے (۴) انسان جب آپس میں باہم گفتگو کرتا ہے تو گویا روح بولتی ہے اور صرف روح اکتسابِ نور کی قابلیت رکھتی ہے جسم بظاہر ایک خارجی شئے ہے۔

نور اخذِ ہنر کرنے میں دل کا میں گنوایا
جوں آئینہ جوہر نے مجھے عیب لگایا

اس شعر میں سودا کہتا ہے (۱) کہ تحصیلِ ہنر میں دل کا نور ضائع ہو گیا جس طرح آئینہ زیادہ صاف ہو کر اپنے جوہر جس جگہ نمایاں کرتا ہے اتنا حصہ زیادہ روشن نہیں رہتا بلکہ دھبوں کی طرح بظاہر عیب دیتا ہے (۲) نور سے مراد وہ دلی مسرت ہے جو انسان کو علایق دنیا کے خوبی کے ساتھ ملنے سے حاصل ہوتی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جب میں نے کسبِ ہنر یعنی باطنی ترقی شروع کی تو وہ مصنوعی نور اڑ گیا۔ اس مصنوعی نور کے جوہر نے مجھے آئینہ کی طرح عیب دار ثابت کیا — دیکھئے تصوف کا کیسا دقیق مسئلہ ہے۔

کر خانۂ گردوں پہ نظر چشم فنا سے
ہے مثل حباب اس کی بھی تعمیر ہوا پر

حکمائے جدید کا نظریہ ہے کہ آسمان حدِ نظر ہے اور اس کی نیلاہٹ ہوا کا رنگ ہے۔ سودا نے اس نظریہ کے ہندوستان میں آنے سے پہلے یہ مسئلہ معلوم کر لیا تھا اور یہ شعر تصوف سے بھی لبریز ہے کہ فنا فی اللہ ہو جاؤ تجھ کو تمام اجسام کی تعمیر ہوا پر نظر آئے گی یعنی سب ہیچ معلوم ہوں گے۔

میر انیس کا شعر ہے۔

اس طرح رگِ ابرِ گہربار پہ دوڑے
جس طرح سے بجلی کی صدا تار پہ دوڑے

اس شعر میں ٹیلی گراف، ٹیلی فون، فونوگراف، بجلی وغیرہ تمام ایجادات موجود ہیں۔ ذوق کے اشعار ہیں۔

بخارِ ارض سے تا ابر ہو اور ابر میں پانی
رواں پانی سے تا دریا ہو اور دریا کو طغیانی

عشق کھچوائے ہے اک رنج جفاکش سے بزور
بارِ صد کوہ الم بے عملِ جرِ ثقیل

خدا دے دوربینی اور اس چشمِ قصور کو
کہ لاکھوں کام اس سے دور کے بے دوربیں نکلے

پرے جا کر نئی دنیا سے بھی گر دیکھو دنیا میں
تو خالی خاکِ آدم سے نہ چپہ بھر زمیں نکلے

تو تم کیا ہو جینے کی ترے بیمارِ ہجراں کو
نہ جنبش نبض میں پائیں کہ نہ گرمی جس کے لمس میں

فلک بھی خانۂ زنبور ہے کثرت سے انجم کی
مگر کیا دخل جز زہراب اس میں انگبیں نکلے

زخم تو سیتے ہیں سب پر سوزنِ الماس سے
چاک سینے کا سلانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

ان اشعار میں بخیہ گری، صناعت، سرجری، طب، جغرافیہ، نجوم سب ہی علوم موجود ہیں غرض اساتذہ کے ایسے بہت سے اشعار پیش کئے جا سکتے ہیں جن میں علوم و فنون پر اشارہ ہے۔ مرزا غالب کی کچھ خصوصیت نہیں ہاں ایک فرق ضرور ہے دیگر اساتذہ زبان پر قادر ہیں، فن کے ماہر ہیں اس لئے مطالب کو صاف و صحیح طور پر ادا کر دیتے ہیں۔ مرزا صاحب زبان پر قادر نہیں اس لئے یا گنجلک ڈال دیتے ہیں یا غلطی کر جاتے ہیں۔

اب مرزا کے شارحوں کی نکتہ سازی ملاحظہ ہو۔

(۲) دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

مولانا سہا نے اس کی شرح اس طرح کی ہے۔

"کہ اب میرے دل کی یہ کیفیت ہے کہ نہ یار کو یاد کرتا ہوں نہ وصل کا خیال ہے اس خانۂ دل کو عشق کی ایسی آگ لگی کہ سب کچھ جل گیا کچھ بھی نہ رہا۔ یہ وہ مقامِ حیرت و عالمِ فراموشی ہے کہ اس کے بعد انا المحبوب اور انا الحق کی کیفیت طاری ہوتی ہے"

یہ مطلب صحیح اور صاف ہے اب طباطبائی صاحب نکتہ سازی فرماتے ہیں۔

"رشک کی آگ ایسی تھی کہ معشوق کو دل سے بھلا دیا اور اس کو غیر سے ملتا دیکھ کر ذوقِ وصل جاتا رہا"

اس شرح کا شعر کے الفاظ سے کچھ تعلق نہیں، ایسے نکات پیدا کرنے کو ہجوِ ملیح کہنا زیبا ہے۔

(۳) دھمکی میں مر گیا جو نہ بابِ نبرد تھا
عشقِ نبرد پیشہ طلب گارِ مرد تھا

مطلب صاف ہے کہ عشق کو ایسے بہادر آدمی کی ضرورت تھی کہ جو تمام مصائب کو جھیل جائے جو شخص مصائب کی تاب نہ لایا اور مر گیا وہ قابلِ عشق نہ تھا۔

استاد بیخود اس کی شرح میں فرماتے ہیں (دھکی میں مر گیا) سے مراد فرہاد ہے جناب نے یہ عجیب نکتہ پیدا کیا ہے تمام قدما اور شعراء نے فرہاد کو جو پختہ کاری کی سند عطا فرمائی تھی اور جس کی آج تک توثیق ہوتی رہی تھی۔ بیخود صاحب اس غریب کی بزرگوں کی عطا کردہ سند کو جوشِ نکتہ رسی میں ضبط فرما رہے ہیں۔

(۴) کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

حالی نے لکھا ہے میری بندگی کیا نمرود کی خدائی تھی کہ اس سے مجھ کو سوائے نقصان کے کوئی فائدہ نہ پہنچا یہاں بندگی سے مراد عبادت نہیں عبودیت ہے۔۔۔ بندگی پر نمرود کی خدائی کا اطلاق کرنا بالکل نئی بات ہے۔ سہا مجددی لکھتے ہیں خدا جس کی میں نے عبادت کی کیا وہ نمرود تھا اور کیا اس کی خدائی نمرود کی خدائی تھی۔ کہ میرا بھلا نہ ہوا ۔۔ میں عرض کرتا ہوں کہ شعر مہمل ہے شاعر خدا جانے کیا کہنا چاہتا تھا اور نہ کہہ سکا عبادت سے عبودیت مراد لینا یہ حالی کی عجیب و غریب ایجاد ہے گویا آسمان سے زمین مراد لیتے ہیں۔ سہا اور آسی نے جو مطلب نکالا ہے وہ ہر اعتبار سے لغو ہے۔ طباطبائی نے خوب بات بنائی ہے اگرچہ لگتی نہیں مگر مضمون کچھ درست ہو جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ غرور و حُسن کی طرف اشارہ ہے۔

(۵) گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھکر

اس شعر کے متعلق آغا محمد باقر بیانِ غالب میں صفحہ ۱۲۷ پر لکھتے ہیں کہ حالی لکھتے ہیں۔

"اس شعر میں اس آیت کے مضمون کی طرف اشارہ ہے جس میں ارشاد ہوا ہے کہ ہم نے امانت کو زمین و آسمان اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا مگر وہ اس کے متحمل نہ ہوئے اور ڈر گئے اور انسان نے

اس کو اٹھا لیا۔

مجھے حالی پر سخت تعجب ہے کہ اس شعر کی شرح سے اس آیت کا کیا تعلق ہے؟ ایسے موقع پر اس آیت یا اس مضمون کا ذکر کوئی صاحبِ علم نہ کرے گا کیوں کہ اس آیت کا تعلق نہ طور سے ہے نہ موسٰی سے شعر کا مطلب صاف ہے کہ تجلی طور پر ہوئی وہ تاب نہ لا سکا ہم پر تجلی ہونی چاہیئے تھی ہم برداشت کر سکتے تھے۔ یہ معاملہ مناسبت کے خلاف ہوا کیوں کہ دستور ہے کہ شرابی کو اس کے ظرف کے موافق شراب دیتے ہیں۔

حالی کہاں سے کہاں بے تک لے گئے اس خوش فہمی پر بے جا نہ ہوگا اگر کوئی حالی کے متعلق کہہ دے (سخن فہمی عالم بالا معلوم شد) کیوں کہ آیت محولہ سورۂ احزاب کی آخری آیت ہے (انا عرضنا الامانۃ علی السمٰوٰت والارض والجبال فابین ان یحملنھا واشفقن منھا وحملھا الانسان۔ ہم نے پیش کی امانت آسمان، زمین اور پہاڑوں پر مگر کسی نے قبول نہ کیا کہ اس کو اٹھائیں اور ہٹ اس سے ڈر گئے اور اٹھا لیا اس کو انسان نے) یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب خدا نے آدم کو پیدا کیا تو آسمان، زمین، پہاڑ سب پر امانت کی پیشکش کی۔ امانت ایمان و ہدایت کا تخم ہے جو قلوب بنی آدم میں بکھیرا گیا جس کو مابہ التکلیف بھی کہتے ہیں تاکہ انسان اس کی نگہداشت کرے اور اپنے عمل سے اس کو سرسبز کرنے کی سعی کرے جیسا کہ حضرت حذیفہ صحابی کی اس حدیث میں ہے (ان الامانۃ نزلت من السماء فی جذر قلوب الرجال ثم علموا من القرآن ۔۔ یہ امانت وہی تخم ہدایت ہے جو اللہ کی طرف سے قلوبِ رجال میں تہ نشین کیا گیا ہے) اس امانت کے تحمل سے سب نے انکار کیا مگر انسان نے اقرار کر لیا صوفیہ امانت سے مراد عشقِ الٰہی لیتے ہیں غرض یہ معاملہ انسان کے زمین پر پیدائش سے پہلے کا ہے اور طور کا واقعہ ہبوطِ آدم سے ہزار ہا برس بعد کا ہے۔ اس لئے اس آیت کا اس واقعہ سے دور کا بھی تعلق

نہیں اس موقعہ پر اس آیت کا ذکر کرنے سے دو باتوں کی طرف خیال جاتا ہے
ایک یہ کہ شارح صاحب نہ آیت کا مطلب سمجھ سکے نہ شعر کے مفہوم تک
رسائی پا سکے دوسرے یہ کہ شارح شاعر کا رتبہ بڑھانے کے لئے اور اُس
کے کلام کی اہمیت جتانے کے لئے مغالطہ دیتا ہے۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ اس
آیت کا اس شعر کے مفہوم سے تعلق ہے تو بقول مرزا یگانہ کہا جائے گا کہ شاعر
گونگا ہے مطلب کو ادا کرنے پر قادر نہ ہو سکا۔ اس آیت کے مفہوم کو حافظ
شیرازی نے نہایت خوبی سے ادا کیا ہے۔

آسماں بارِ امانت نتوانست کشید
قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند

اردو میں بھی یہ ایسا مضمون ہے کہ جس کو قریب قریب ہر شاعر نے لیا ہے اور نہایت
صفائی سے ادا کیا ہے افسوس مرزا صاحب ایسے عام مضمون کو بھی ادا نہ کر سکے

(میر) کی عرض جو متاعِ امانت ازل کے بیچ
سب اور رہ سکے نہ خریدار ہم ہوئے

(میر) سب پہ جس بار نے گرانی کی
اُس کو یہ ناتواں اٹھا لایا

شہزادہ مرزا معز الدین ثابت خلف شاہ عالم ثانی فرماتے ہیں۔

آفریں دل کو ترے ثابت وگرنہ بارِ عشق
نے زمیں سے اُٹھ سکا نے آسماں سے اٹھ سکا

(۶) رحم کر ظالم کہ کیا بودِ چراغِ کشتہ ہے
نبضِ بیمارِ وفا دودِ چراغِ کشتہ ہے

شعر کا مطلب یہ ہے کہ بیمارِ وفا کی یہ حالت ہے کہ اب اُس کی نبض بجھے ہوئے
چراغ کے دھوئیں کی مانند چل رہی ہے یعنی انتہا درجے کا ضعیف اور کمزور
ہو گیا ہے اُس کی ہستی اس وقت ایسی ہے جیسے بجھے ہوئے چراغ کے دھوئیں

کی ایسی حالت پر تجھے رحم کرنا چاہیئے۔

طبا طبائی کی جدت طرازی ملاحظہ ہو لکھتے ہیں۔

"لطف یہ ہے کہ نزع کے وقت جو نبض کی کیفیت ہوتی ہے اطباء اس کو دودی کہتے ہیں"

آسی لکھتے ہیں۔

"طبا طبائی نے آخری نبض کو دودی لکھا ہے دودی کمزور ضرور کرتی ہے بالکل قوت کو ساقط نہیں کرتی"

اس طرح غالب کے کلام میں علمِ طب کو پیدا کیا گیا ہے کہاں دودِ چراغِ کشتہ اور کہاں نبضِ دودی کیا تک ملائی ہے جس پر بے ساختہ ہنسی آتی ہے۔ معلومات کی یہ کیفیت ہے کہ نزع کے وقت کی نبض کو نبضِ دودی بتاتے ہیں۔ کاش طبا طبائی پہلے نبض کا کوئی رسالہ دیکھ لیتے یا کسی طبیب سے دریافت کر لیتے تو یہ سخت ٹھوکر نہ کھاتے نبضِ دودی ضرور کمزور نبضوں میں سے ہے مگر عالمِ نزع کی نبض نہیں۔ نزع کے وقت جو نبض چلتی ہے اس کو نبض نملی کہتے ہیں۔

طبا طبائی صاحب کو خیال نہیں رہا ایک اور جگہ بھی مرزا کے کلام میں علم نبض کا ذکر رہے۔

بزم مے وحشت کدہ ہے کس کی چشمِ مست کا
شیشے میں نبضِ پری پنہاں ہے موجِ بادہ سے

ضعیف نبض کی ایک قسم نبض موجی بھی ہے اس شعر میں اس کی طرف اشارہ ہے ایسی تک بندیوں سے دنیا کی کوئی صنعت کوئی علم، کوئی فن ایسا باقی نہ رہے گا جو دیوانِ غالب میں نہ ہو اور اگر یہی سمجھا جائے کہ غالب کا مقصد یہاں نبض دودی سے ہے تو پھر وہی بات زبان پر آئے گی کہ شاعر گونگا ہے مطلب ادا

لہ رسالہ آئینۂ نبض صد ۱۳ محبوب المطابع دہلی ۱۳۱۲ھ)

نہیں کر سکا۔ دیکھئے ذوق کس صفائی سے نبض کا بیان کرتے ہیں اور صحیح کہتے ہیں۔

نبض نملی ہے کہاں میری خلاطوں چلتی
ہے یہ ضعف اتنا کہ چیونٹی بھی نہیں یوں چلتی

توقع کیا ہو جینے کی ترے بیمار ہجراں کی
نہ جنبش نبض میں جس کے نہ گرمی جس کے ملمس میں

کسی رنج کش کو دنیا تو کچھ اس کو سود ہوتا
دلِ سخت کاش کا فر حجر الیہود ہوتا

شعر صاف ہے معنی مطلب بھی صاف ہے اس کے علاوہ دوسری خوبی یہ ہے کہ (رنج کش) اس مریض کو کہتے ہیں جو مرض ریگِ مثانہ میں مبتلا ہو اور حجر الیہود سنگ گروہ و ریگ مثانہ کے لئے بے حد مفید دوا ہے۔

(۷) اک خوں چکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

نہایت عمدہ اور صاف شعر ہے اس میں کسی قسم کی گنجلک نہیں مگر حالی فرماتے ہیں کہ یہ شعر حقیقت و مجاز دونوں پہلو رکھتا ہے مگر یہ نسبت مجاز کے حقیقت پر زیادہ چسپاں ہے ـــ کوئی بتلائے حقیقت سے اس شعر کا کیا تعلق ہے اس ہی قسم کی غیر واقعی شرحیں لوگوں کو خلاف لکھنے پر آمادہ کرتی ہیں۔

(۸) زمانہ عہد میں اُس کے ہے محوِ آرائش
بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لئے

اس کی شرح جو حالی نے کی ہے اس کے متعلق طباطبائی نے لکھا ہے۔

"حالی نے جو معنی لکھے ہیں اس پر کوئی قرینہ نہیں"

(۹) تھی وطن میں شان کیا غالب کہ ہو غربت میں قدر
بے تکلف ہوں وہ مشتِ خس کہ گلخن میں نہیں

کوڑا کرکٹ گلخن یعنی انگیٹھی یا بھٹی میں ہوتا ہے تو جل جاتا ہے اور اگر گلخن میں نہیں

ہوتا تو بیکار اور خراب جاتا ہے غالب نے اس شعر میں گلخن سے مراد وطن لی ہے اور خس سے اپنی ذات، مطلب یہ ہے کہ وطن میں تھا تو مصائب سے جلتا تھا پردیس میں، ہوں تو بے قدر ہوں۔ آسی فرماتے ہیں۔

"اس شعر میں مذاقِ تصوف ہے یعنی جس طرح ہر شے آگ میں گر کر آگ ہو جاتی ہے اسی طرح عارف کو شاہدِ حقیقی کے ساتھ اتصال ہو جاتا ہے نہیں تو ایک مشتِ خس ہے جس کا وطن عدم اور غربت امکان ہے۔"

غور کا مقام ہے کہ یہ مطلب کس طرح اس شعر پر چسپاں ہو سکتا ہے۔

(۱۰) سب کو مقبول ہے دعویٰ تری یکتائی کا
روبرو کوئی بتِ آئینہ سیما نہ ہوا

صاف مطلب ہے کہ تمام دنیا کے حسین تیرے حسن بے مثال کے قائل ہیں کسی کو سامنے آنے کی جرأت نہیں ہوتی اگر کوئی شخص اس شعر کو کھینچ تان کر تصوف کی طرف لے جانا چاہے تو کہہ سکتا ہے کہ خدا کی یکتائی کا بیان ہے توحید کا ذکر ہے کیوں کہ یکتائی کا لفظ موجود ہے۔ مگر آغا محمد باقر لکھتے ہیں کہ وحدتِ وجود کی طرف اشارہ ہے یہ شعر مجازی معنی کا شعر ہے مگر کھینچ تان کر کہا جا سکتا ہے کہ توحید کو بیان کیا ہے وحدت الوجود سے کچھ تعلق نہیں۔ وحدت الوجود اور توحید میں فرق ہے یہ ہیں دیوانِ غالب کے شارح جو توحید اور وحدت الوجود میں فرق بھی نہیں جانتے۔

(۱۱) آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

مطلب صرف اس قدر ہے کہ میرا معشوق اس قدر شائق و محوِ آرائش ہے کہ نقاب میں بھی آئینہ ہی رہتا ہے لیکن طباطبائی لکھتے ہیں۔

"نقاب استعارہ ہے حجابِ قدس کا اور آئینہ اس میں علمِ ما یکون و ما کان کا حکم رکھتا ہے۔"

استاد بیخود لکھتے ہیں۔

"آرایش جمال سے فارغ ہونا تفسیر ہے۔ (کل یوم فی شان) کی"
ایسی تک لگا نا کلام کو صریح مہمل قرار دیتا ہے صاف شعر اور صاف مطلب ہے۔
اس کو کہاں پہنچا یا کہ سمجھنے والا کو ہنسی آئے۔

(۱۲) اُگ رہا ہے در و دیوار پہ سبزہ غالب
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

شعر کا مطلب صاف ہے کہ ہم وحشت زدہ ہو کر سبزہ زار سے دل بہلانے کے لئے جنگلوں میں مارے مارے پھرتے ہیں اور ہمارے گھر میں در و دیوار پر سبزہ اُگ رہا ہے جس کی وجہ سے سبزہ زار کی سی بہار معلوم ہوتی ہے لیکن جب مکان چھوڑ دیتا ہے تو اس میں گھاس وغیرہ پیدا ہو جاتی ہے گویا گھر چھوڑ کر بیاباں نوردی کرتے ہوئے مدت گزر گئی۔ آغا باقر نے اس شعر میں کئی مفہوم پیدا کئے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔

"اس خانۂ ویرانی کو دیکھنے کے لئے دل اس طرح بے چین ہے جیسے جلوۂ بہار کے دیکھنے کے لئے ہوتا ہے"

اس نکتہ کا شعر کے الفاظ یا مفہوم سے کوئی تعلق نہیں معلوم ہوتا۔

(۱۳) دیوار بارِ منتِ مزدور سے ہے خم
اے خانماں خراب نہ احساں اٹھائیے

آغا باقر اس کی شرح میں لکھتے ہیں۔

"کہنا یہ چاہتے ہیں کہ دنیا میں کسی کا احسان اٹھانا نہیں چاہیئے کیوں کہ احسان ایسا بوجھ ہے جس کو بے جان دیوار بھی برداشت نہیں کر سکتی پھر انسان کا کیا ٹھکانا ہے دیوار کے جھک جانے کو مزدور کے احسان کا نتیجہ قرار دے کر خانماں خراب شخص کو عبرت دلاتے ہیں کہ وہ مکان کی تعمیر سے باز رہے۔

شرح کے تحتِ خط فقروں کا شعر کے الفاظ یا مفہوم سے کوئی واسطہ نہیں یہ ایجاد

شارح صاحب نے اس لئے کی ہے کہ یہ شعر بھی فقر و تصوف کی فہرست میں آجائے

(۱۴۲) غالب خدا کرے کہ سوارِ سمندِ ناز
دیکھوں علی بہادرِ عالی گہر کو میں

آغا باقر اس کی شرح میں لکھتے ہیں۔

"سمندِ ناز وہ گھوڑا جو ناز و انداز سے قدم اٹھاتا ہے خدا کرے
عالی گہر علی بہادر کو میں سمندِ ناز پہ سوار دیکھوں۔"

اس شعر کا یہی مطلب صحیح ہے علی بہادر کوئی شہزادہ یا کوئی امیر ہوگا اس کے متعلق لکھا ہے لیکن غالب کے کلام کو تصوف اور حقانیت کی طرف کھینچنے والوں نے اس سیدھے سادے شعر میں بھی نکتہ پیدا کر لیا۔ آسی اور سہا لکھتے ہیں کہ حضرت علی کی زیارت کا شوق ظاہر کیا ہے۔

جس طرح ان شارحوں نے مرزا غالب کے کلام میں نکاتِ تصوف پیدا کئے ہیں اسی سعی سے غالب کا ہر مصرعہ آیاتِ قرآنی و احادیث محبوبِ سبحانی اور مسائلِ تصوف کا ترجمان ثابت ہوگا میں عرض کروں گا دیکھئے کیا باریک و نفیس نکاتِ تصوف ہیں۔

صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو
دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کئے

غیر سے مراد بے سلسلہ درویش یعنی مجاذیب ہیں مطلب یہ ہے کہ ہمارے پیر و مرشد اب مریدوں کو بغیر طلب فیضانِ روحانی پہنچانے لگے یہ عادت ان کی شاید مجاذیب کی صحبت سے ہوگئی کیونکہ وہ ہر کس و ناکس پر توجہ ڈال دیتے ہیں۔

غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں
بوسے کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں

غالب اپنے مرشد سے کہتے ہیں کہ ذکر ارہ کی تعلیم آپ مجھ کو زبانی کر رہے ہیں کرکے دکھایئے۔

جس طرح شوکت تھانوی نے مزاحیہ شرح لکھ کر شارحین کی خدمات کو درخشاں کیا ہے اسی طرح کوئی صاحب ہمت ایک شرح لکھیں کہ ہر مصرعہ کے ساتھ ایک آیت یا حدیث درج کریں اور اس کا نام عرفانِ غالب رکھیں کچھ مشکل کام نہیں حالی اور آسی نے داغ بیل ڈال دی ہے اب دوسرے دعویداروں کو عمارت بنانے کا حق ہے — مرزا یگانہ نے غالب شکن میں مرزا غالب پر یہ اعتراض کیا کہ باوجود نمک خوار ہونے کے تباہی سلطنت پر اظہارِ ملال کے طور پر ایک مصرعہ بھی نہ لکھا یگانہ کو کیا خبر تھی کہ یہ غالب پرستوں کے بائیں ہاتھ کا کرتب ہے ایک صاحب نے فوراً لکھ دیا کہ یہ غزل زوالِ سلطنت کا مرثیہ ہے اب اس عاشقانہ غزل کو ملاحظہ فرمایئے اور زوالِ سلطنت کے مرثیہ کا خیال کیجیے۔

دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی
دونوں کو اک نظر میں رضامند کر گئی

شق ہو گیا ہے سینہ خوشا لذتِ فراق
تکلیف پردہ داری زخمِ جگر گئی

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی

اڑتی پھرے ہے خاک مری کوئے یار میں
بارے اب اے ہوا ہوسِ بال و پر گئی

دیکھو تو دل فریبیٔ اندازِ نقشِ پا
موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

نظارہ نے بھی کام کیا واں نقاب کا
مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی

فردا و دی کا تفرقہ یکبار مٹ گیا
کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی

مارا زمانے نے اسد اللہ خاں تمہیں
وہ ولولے کہاں وہ جوانی کدھر گئی

اہلِ نظر غور فرمائیں کہ اس غزل کا مرثیۂ سلطنت سے کیا واسطہ ہے ایسی عینکیں لگائیں تو دیوانِ غالب اپنے عہد کے تمام واقعات و حادثات کی تاریخ ثابت ہوگا مثلاً

---

۵۷ انتقادیات صفحہ ۲۵

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

یہ شعر ہنگامہ ۱۸۵۷ء کی پیشین گوئی ہے۔

دھمکی میں مر گیا جو نہ بابِ نبرد تھا
عشقِ نبرد پیشہ طلب گارِ مرد تھا

اس شعر میں اُس وبائے عام کا ذکر ہے جو مرزا کے زمانے میں دہلی میں پھیلی تھی جس کا ذکر مرزا نے اپنے خطوط میں بھی کیا ہے۔

شب کہ وہ مجلس فروزِ خلوتِ ناموس تھا
رشتۂ ہر شمع خارِ کسوتِ فانوس تھا

کوئن وکٹوریہ کے شہنشاہِ ہند ہونے کا مذکور ہے۔

اور ایک صاحب نے اشعارِ ذیل کو ۱۸۵۷ء کے مصائب کا ترجمان قرار دیا ہے۔

ہندوستان سایۂ گل پایہ تخت تھا	جاہ و جلالِ عہدِ وصالِ بتاں نہ پوچھ
ہر داغِ تازہ یک دلِ داغِ انتظار ہے	عرضِ فضائے سینۂ درد امتحاں نہ پوچھ
گلشن میں بندوبست برنگِ دگر ہے آج	قمری کا طوق حلقۂ بیرونِ در ہے آج
آتا ہے ایک بادہ دلِ ہر فغاں کے ساتھ	تارِ نفس کمندِ شکارِ اثر ہے آج

ان اشعار اور ان غالب کے مداحوں کے متعلق ڈاکٹر عبداللطیف صاحب لکھتے ہیں۔

جو اشخاص[1] ان اشعار کو ۱۸۵۷ء کی مصیبتوں کا ترجمان سمجھتے ہیں وہ شاید اس سے ناواقف ہیں کہ یہ غدر کے غالباً چالیس سال قبل لکھے گئے ملاحظہ ہو دیوانِ غالب قلمی نسخہ بھوپال جو ۱۸۲۱ء میں ترتیب دیا گیا۔

---

[1] غالب مصنفہ عبداللطیف ص ۷۹

ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

یہ ایک فخریہ شعر ہے جو شعراء کا دستور ہے لیکن مرزا کے مداح و شارح یہاں بھی جدت طرازی پر اُتر آئے۔ آغا باقر اس کی شرح میں لکھتے ہیں۔

"میں آج ادائے خاص سے نکتہ سرا ہوا ہوں یعنی میں نے غزل میں مدح لکھی ہے میں یارانِ نکتہ داں کو صلائے عام دیتا ہوں کہ وہ بھی غزل میں مدح کرنے کا نیا ڈھنگ اختیار کریں"۔

اگر درحقیقت اس شعر کا صحیح مفہوم یہی ہے تو معلوم ہوا کہ مرزا کو قدماء کے کلام پر عبور نہ تھا۔ اور شارح کو بھی تحقیق نہیں اس کا ذکر آگے آئے گا۔

(۱۶) رسالہ نیرنگِ خیال لاہور عید نمبر اپریل و مئی ۳۲ء میں میر ولی اللہ صاحب بی اے ایل ایل بی وکیل ایبٹ آباد نے مرزا غالب کے اس شعر کی شرح کی ہے۔

ڈھونڈے ہے اُس مغنی آتش نفس کو جی
جس کی صدا ہو جلوۂ برقِ فنا مجھے

اس کی شرح میں الفاظ سے عجیب عجیب نکات پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور بڑھتے بڑھتے ان کی سعی اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ لفظ (جلوہ) کے تحت میں انھوں نے آیتِ قرآنی (ولما جاء موسیٰ طبقا تنا وکلمہ ربہ قال رب ارنی انظر الیک) سے استدلال کیا ہے اگر یہی استدلال ہے اور یہ بڑی خوبی ہے اور کمال ہے تو جلوہ کا لفظ کس شاعر نے نہیں باندھا ابتدا سے آج تک باندھتے چلے آئے ہیں اس میں مرزا غالب کی کیا خوبی اور خصوصیت ہے اور اگر واقعی اس لفظ کا شعر میں لے آنا بہت کچھ قابل داد ہے اور آیتہ مذکورہ کا مصداق ہے تو اس داد کا مستحق وہ شاعر ہے جس نے سب سے پہلے اس لفظ کو باندھا ہے مرزا غالب تو بہت بعد کے لوگوں میں ہیں۔

غرض یہ کہ مرزا غالب کے مداحوں نے جن کو اہلِ نظر و صاحبانِ فضائیف نے غالب[1] پرست خطاب دیا ہے ایسی عجیب عجیب گل افشانیاں کی ہیں جو نہایت ہی تعجب خیز اور مضحکہ انگیز اور گمراہی پھیلانے والی ہیں۔

خصوصیاتِ غالب پر نظر

غالب کے مداحوں نے اُن کی چند خصوصیات قرار دی ہیں اور ان میں بھی وہی افراط و تفریط سے کام لیا ہے۔

(۱) بعض لفظ یا کوئی مختصر جملہ شعر میں محذوف کر کے شعر کو اس طرح ترتیب دیتے ہیں کہ محذوف لفظ یا جملہ خود بخود سمجھ میں آجاتا ہے اور لطف دے جاتا ہے۔
لیکن یہ وصف صرف مرزا غالب ہی کے کلام میں نہیں اس طرز کے اشعار ہر دور کے اساتذہ کے کلام میں موجود ہیں مگر کم ہیں سب سے زیادہ اس طرز کو مومن نے برتا ہے اور خوب برتا ہے مرزا غالب نے ان کی تقلید کی ہے اور بعض جگہ حذف میں سخت ٹھوکریں کھائی ہیں۔ اس دور کے دیگر اساتذہ ناسخ، آتش، نصیر، ذوق کے کلام میں اس قسم کے اشعار ہیں۔
شعر میں کہیں لفظ یا ایک چھوٹے جملہ کا حذف اس صورت میں جائز ہے اور لطیف ہے کہ شعر مہمل نہ ہو جائے اور کوئی امر خلافِ قواعد ظہور پذیر نہ ہو مرزا غالب کے کئی شعروں میں حذف کی ناگوار مثالیں ہیں۔

بدگمانی نے نہ چاہا اُسے سرگرمِ خرام
رُخ پہ ہر قطرہ عرق دیدۂ حیراں سمجھا

آغا محمد باقر اس طرح شرح کرتے ہیں۔
"نہ چاہا — گوارا نہ کیا۔ قطرہ عرق (فکِ اضافت) پسینہ کی بوند

---

[1] غالب مصنفہ عبداللطیف ص۱۳

دیدۂ حیران یعنی چشم رقیب میری بدگمانی نے یہ بھی گوارا نہ کیا کہ وہ محوِ خرام رہے
کیونکہ چلنے سے اُس کے ماتھے پر جو پسینہ آجاتا ہے وہ مجھے دیدۂ حیراں (چشم
رقیب) معلوم ہوتا ہے اور میرا رشک گوارا نہیں کرتا کہ رقیب کی چشم
حیراں اُس کے ماتھے پو جم جائے۔

اس شعر میں بدگمانی سے پہلے لفظ (میری) محذوف ہے (رُخ پہ) سے پہلے (میں)
محذوف ہے (عرق) کے بعد (کو) محذوف ہے اس کے بعد (رقیب) محذوف
ہے پھر (کی) محذوف ہے۔

ایک شعر میں متفرق جگہ متفرق الفاظ کا حذف اہلِ فن جائز نہیں رکھتے
اس قسم کے ناقص حذف کی مثالیں اغلاط میں دیکھئے ایسے شعر کو مہمل ہی کہا جائے گا
اور اس طرز کو بھی مرزا صاحب آخر تک نبھا نہ سکے آخر میں اس کو تقریباً ترک
کر دیا تھا۔

مولوی حکیم عبدالحیٔ لکھتے ہیں۔

"مگر مومن[1] کے یہاں یہ بات بہت نمایاں ہے کہ اکثر موقعوں پر مضمون
کے بعض اجزاء چھوٹ جاتے ہیں جس سے ایک خاص لطف پیدا ہو جاتا ہے
یہ وہ موقعے ہوتے ہیں جہاں سننے والے کا ذہن خود بخود اُس جزو کی طرف
منتقل ہو سکتا ہے یہ شاعری کا ایک نازک پہلو ہے جس میں کبھی بڑے قباحت
بھی پیدا ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے شعر سخت پیچیدہ ہو جاتا ہے"

مولوی عبدالسلام ندوی لکھتے ہیں۔

"یہ مومن[2] کا خاص طرز تھا اور وہ اس پر باستقلال قائم رہے"

نواب امداد امام اثر لکھتے ہیں۔

"اور[3] ایک ہی رنگ رہا (مومن کا)

---

[1] گلِ رعنا صـ ۳۰۲ [2] شعر الہند حصہ اول صـ ۱۵۶ [3] کاشف الحقائق حصہ دوم صـ ۱۰۰

(۲) جو وسیع خیال متعدد اشعار میں ادا کیا جا سکتا ہو اس کو ایک شعر میں ادا کر دیتے ہیں۔

یہ وصف بھی مرزا غالب کے ساتھ مخصوص نہیں ان کے تمام معاصرین کے کلام میں پایا جاتا ہے۔ نیاز فتحپوری لکھتے ہیں۔

"غالب[۱] سے مخصوص سمجھنا درست نہیں اس وقت جتنے کامیاب شعراء تھے سب کے یہاں کم و بیش یہی دونوں رنگ پائے جاتے ہیں علی الخصوص مومن کہ اگر اس کے کلیات کا استقصاء کیا جائے تو باندک تفاوت کئی دیوان غالب نکل سکتے ہیں۔"

مولوی عبدالسلام لکھتے ہیں۔

"اس دور[۲] کی ایک خصوصیت جیسا کہ مولانا شبلی مرحوم نے شعرالعجم حصہ سوم کے دیباچہ میں لکھا ہے یہ ہے کہ کسی وسیع خیال کو جو متعدد اشعار میں ادا ہو سکتا تھا ایک ہی شعر میں ادا کر دیتے ہیں اور غالب کے یہاں بھی اس قسم کے بکثرت اشعار ہیں"

(۳) نازک خیالی تشبیہات و استعارات کی جدت۔

یہ وصف بھی مرزا غالب کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ اس دور کے تمام اساتذہ کے کلام میں یہ وصف ہے۔ مولوی عبدالسلام لکھتے ہیں۔

"اس[۳] دور کی ایک بڑی خصوصیت استعارات کی جدت اور تشبیہات کی ندرت ہے۔"

(۴) فارسی الفاظ اور ترکیبوں کا استعمال۔

یہ بھی اس دور کی خصوصیت ہے غالب ہی کے ساتھ مخصوص نہیں۔ نیاز فتحپوری

---

[۱] مجموعہ استفسارات و جواب جلد دوم ص ۴۲۵ – ۴۳۶ [۲] شعرالہند حصہ اول ص ۲۵۳
[۳] مجموعہ استفسارات ص ۲۵۷

لکھتے ہیں۔

"جس زمانہ میں مومن و غالب پائے جاتے ہیں اس وقت فارسی کی ترکیبوں کا استعمال بہ کثرت رائج تھا اور کم و بیش اس رنگ کو سب ہی نے اختیار کیا لیکن یہ واقعہ ہے کہ مومن و غالب سے زیادہ پاکیزگی و نفاست کا لحاظ کسی نے نہیں رکھا۔[1]

(۵) غالب کی خصوصیات تصنیف کہنے والوں میں سے آغا محمد باقر صاحب نے ایک یہ خصوصیت تصنیف کی ہے کہ وہ غزل میں عشقیہ شعر کہتے تھے۔ دو ایک شعر ممدوح کی تعریف میں آتے ہیں جیسے ایک غزل میں یہ شعر ہے۔

زیبا ہے اوروں کو بھی تا اسے نظر نہ لگے
بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لئے

صاحب شعر الہند نے بھی اس خصوصیت کو لکھا ہے۔

کوئی دریافت کرے کہ حضرت یہ کیا کوئی علمی یا فنی خصوصیت ہے یا شاعری کے کمالات میں سے ہے، اور اگر آج آپ اس کو داخل خصوصیات اور کمال کرتے ہیں تو اس کمال کا موجد شاہ حاتم استاد سودا معلوم ہوتا ہے۔ شاہ حاتم سے نواب نے ولی کی غزل پر غزل لکھنے کی فرمائش کی اس پر فرماتے ہیں۔

اے ولی مجھ سے تو آزردہ نہ ہونا کہ مجھے | یہ غزل کہنے کو نواب نے فرمائی ہے
ہے وہی فخر زماں کو ن علی اصغر خاں | جس کی ہمت کی اب حاتم نے قسم کھائی ہے
حاتم اب خوش ہو تو بے ہجر کے گزرے ایام | بارے غمخوار کے ملنے کی گھڑی آئی ہے

مصحفی فرماتے ہیں۔

تخت طاؤس پہ جب ہوئے سلیماں کا جلوس
مور رکھلا ہاتھ میں بتی بال ہما کا لے لوں

---

[1] مجموعہ استفسار ارزانی صد ۲۳۴ جلد سوم

(۶) تہذیب و متانت

یہ بھی اس دور کی خصوصیات میں سے ہے ایک غالب ہی کے ساتھ مخصوص نہیں۔

(۷) آغا محمد باقر نے لکھا ہے کہ سہرا اردو میں مرزا غالب کی ایجاد ہے۔ ان سے پہلے کسی نے نہیں لکھا ممکن ہے ان کی یہ تحقیق صحیح ہو لیکن مرزا کے ایک شعر سے اس میں شبہ واقع ہوتا ہے اور خیال ہوتا ہے کہ ان سے پہلے سہرا لکھنے کا رواج ہو گیا تھا لکھتے ہیں۔

سہرا لکھا گیا زرہ امتثال امر
دیکھا کہ چارہ غیر اطاعت نہیں مجال

بادشاہ نے سہرا لکھنے کا امر جب ہی تو فرمایا ہوگا جب پہلے سے رواج ہوگا۔

خصوصیات میں عظیم الشان مغالطہ

ایک صاحب نے لکھا ہے کہ موجِ نفس، موج سراب تشنگی یہ مرزا غالب نے پیدا کی ہیں حکیم عبدالحی گلِ رعنا میں لکھتے ہیں کہ سانس کی تشبیہ موج سے مرزا کی پیدا کردہ ہے ان حضرات کو یہ معلوم نہیں کہ دونوں تشبیہیں مرزا سے کہیں پیش ایک صدی قبل قائم چاندپوری نے ایجاد کی ہیں فرماتے ہیں۔

موجِ نفس سے ناداں غافل نہ ہو کہ ہر دم
یہ ہستی دو روزہ نخلِ کنار جو ہے

جو دیکھتے ہو اس میں خیالات و خواب ہے

دنیا بھی اک نمونہ موجِ سراب ہے

حالی نے گلبانگ وغیرہ کئی لفظوں کو لکھا ہے کہ یہ مرزا نے اردو کو عطا کئے۔ غالباً یادگار غالب ہی سے مولوی یحییٰ تنہا نے مرآۃ الشعراء جلد اول میں ذکرِ غالب میں نقل کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

" شوخی تحریر، دامِ شنیدن، خمارِ رسوم، آتشِ خاموش، خانہ زادِ زلف،

شمعِ شبستان، دریا ۔۔ مے، جمع و خرجِ دریا، آئینۂ دریا، تکلف برطرف، دریا آشنا، محشرِ خیال، سلک ۔ فیت، وادیٔ خیال، دریائے بے تابی، گرمِ تماشا، دامِ تمنا، چشمِ صحرا، عناد و وحشت، شررِ جستہ وغیرہ وغیرہ ان تراکیب سے زبان میں بے حد وسعت پیدا ہو گئی ہے اور د سروں کو بھی موقع ہے کہ وہ اسی انداز پر اظہارِ خیال کے لئے ترکیبیں ایجاد کریں۔

میں یہ تو نہیں کہ سکتا کہ ان میں کوئی ترکیب یا کوئی لفظ بھی مرزا کا پیدا کردہ نہیں ہے لیکن ان میں سے اکثر مرزا سے پہلے سے اردو شاعری میں مستعمل تھے، مجھے یاد نہیں رہا قدما میں سے کس کا شعر ہے۔ اس کا ایک مصرعہ مجھے یاد ہے۔

تو بھی ہو گرمِ تماشا یہ تماشا ہووے

گلبانگ:۔ (ناجی)
نہ ہو نارا ہ میں گلبانگ شہرت
جو روتا راہ میں خاراں سے یوسف

تکلف برطرف:۔ (ولی دکنی) میری طرف ساغر بکف آیا ہے وہ مستِ حنا
اے دل تکلف برطرف مستانہ ہو مستانہ ہو

یقین ہم عصرِ میر:۔
سبھی مرتے ہیں خوش وقتی پہ جی دیتے ہیں شادی پر
تکلف برطرف یہ نوحہ گر بندہ ہے ماتم کا
یہ جیوے ہجر میں وہ وصل میں بھی جی نہیں سکتا
تکلف برطرف بلبل کو پروانے سے کیا نسبت

(حاتم)
تکلف برطرف سو سدرہ و طوبیٰ سے بہتر ہے
مرے سر پر یہ تیرا سایۂ دیوار دنیا میں

ایک صاحب نے منت کش کو بھی اس فہرست میں داخل کیا ہے لیکن میر کا شعر ہے۔

بہت چاہا ہے ابرِ تر نے لیکن
نہ منت کش ہوا گلشن ہمارا

آتشِ خاموش:۔ اس کو بھی لوگوں نے ایجاداتِ غالب میں شامل کیا ہے مگر یہ ولی دکنی

کے کلام میں موجود ہے۔ مجھے وہ شعر یاد نہیں رہا تنہا صاحب نے مرأۃ الشعراء میں ولی کے ذکر میں لکھا ہے کہ ولی نے اسے استعمال کیا ہے۔

شمع شبستاں۔ اس لفظ کو بھی غالب کی ایجاد بتایا گیا ہے لیکن غالب سے کم و بیش ایک صدی قبل یک رنگ دہلوی مرثیہ میں فرماتے ہیں۔

اندھیر ہے جہاں میں کہ اب شاہیوں کے ہاتھ
ہے سر بریدہ شمعِ شبستانِ کربلا

عربی الفاظ مرقومہ بالا میں سے اکثر قدماء کے کلام میں میری نظر سے گزرے ہیں اب ان حضرات کی معلومات و بیان کے متعلق کیا کہا جائے۔

پروفیسر آزاد نے غالب کو دورِ پنجم کے شعراء میں شامل کیا ہے اور اس دور میں ناسخ و آتش کے بعض تلامذہ کا ذکر کیا ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اساتذہ مذکورہ بالا کے متعلق مبصرین کی رائیں نقل کی جائیں۔

ناسخ

شمس العلماء پروفیسر آزاد لکھتے ہیں۔

"غزلوں میں شوکتِ الفاظ اور بلند پروازی اور نازک خیالی بہت ہے اور تاثیر کم صائب کی تشبیہ و تمثیل کو اپنی وسعت میں ترکیب دے کر ایسی دست کاری اور مینا نگاری فرمائی کہ بعض موقع پر جلال اور ناصر علی کی حد میں جا پڑے اور اردو میں وہ اس بے صاحب طرز قرار پائے۔"[1]

شمس العلماء نواب امداد امام اثر لکھتے ہیں۔

"ناسخ کی تشبیہیں اکثر بلند خیالی کی داد دیتی ہیں"[2]

---

[1] آبحیات [2] کاشف الحقائق

مولوی عبدالسلام ندوی لکھتے ہیں۔

"انھوں[1] نے خواجہ آتش کی طرح جابجا رندانہ مضامین بھی نہایت جوش و سرمستی سے ادا کئے ہیں ۔۔۔ انھوں نے جابجا اخلاق و تصوف کے مسائل بھی نہایت دل آویزی سے بیان کئے ہیں تصوف اور اخلاق کے ساتھ وہ کہیں کہیں فلسفیانہ مضامین بھی نہایت خوبی کے ساتھ باندھ جاتے ہیں ۔۔۔ کہیں کہیں ان کے استعارات و تشبیہات میں سادگی آمیز لطافت بھی موجود ہے ۔۔۔ شیخ ناسخ کے کلام کی ایک بڑی خصوصیت تمثیل ہے اور وہ اخلاقی مضامین کو اکثر اس طریقہ سے باندھ دیتے ہیں۔"

مولوی حکیم عبدالحی لکھتے ہیں۔

"ناسخ[2] کی قوت تخیل زبردست ہے۔"

شمس العلماء اثر لکھتے ہیں۔

"ناسخ[3] زبانِ اردو کے مصلح گزرے ہیں ۔ شیخ نے اردو کو خراش تراش کر ایسا درست کر دیا کہ اب اس کی لطافت اور صفائی فارسی سے کچھ کم نہیں معلوم ہوتی ذوق نے صرف مضمون آوری کی طرف توجہ رکھی اور اصلاح زبان پر مطلق مائل نہ ہوئے مومن کو بھی اس جانب کچھ میلان نہ ہوا اور مرزا غالب نے تو فارسی کی اس قدر آمیزش کر دی کہ اردو پر فارسی کا شبہ ہونے لگا حضرت نے فارسی الفاظ اور فارسی جملوں کو اس طرح باندھا کہ اردو فارسی نما ہو گئی اس کے برخلاف شیخ نے الفاظ فارسی سے اجتناب نہ کیا مگر ترکیب ایسی ملحوظ رکھی کہ اردو اردو رہ گئی بلکہ اگر کسی فارسی جملے کو بھی اپنے کلام میں جگہ دی تو فارسی کو اردو کر کے دکھا دیا مثلاً

---

[1] شعرالہند حصہ اول [2] گل رعنا [3] کاشف الحقائق جلد دوم صفحہ ۱۳۸ و ۱۴۰

سوالِ وصل پر ملتا پریرو تیری ابرو کا
اشارہ ہے برات عاشقاں بر شاخِ آہو کا

ان کی نازک خیالی اور بلند پروازی نادر انداز رکھتی ہے کلام بلاغت و فصاحت کے ساتھ شیر و شکر ہو رہا ہے دونوں دیوان مضامین کے معدن ہیں سوائے ان خوبیوں کے ان کا کلام پُر از متانت، جلالت، شوکت، تہذیب و وقار نظر آتا ہے دشوار دشوار مضامین کو آسانی کے ساتھ باندھ جاتے ہیں ان کے لفظوں کی نشست عقدِ مروارید کا حکم رکھتی ہے۔

پروفیسر فراق گورکھپوری لکھتے ہیں۔

"بحیثیت ادبی ڈکٹیٹر[1] کے ناسخ کا کوئی ثانی نہیں ــــ اس کے اشعار کی بلند آہنگی اندازِ بیان کی تکمیل بندش کی چستی مصرعوں کے کس بل اور زور وہ چیزیں ہیں جو اس پہلوانِ سخن کے (۷) ۱۲۹ شعر و نثر کا اثر اس کی شاعری میں نمایاں کر رہے ہیں اس کے معنی و مفہوم کو آپ سراسر تصنع کہیں جہاں تک منضبط اسلوبِ بیان کا تعلق ہے ناسخ کے احسان سے اور تو اور غالب، ذوق، مومن، آتش اور ناسخ کے بعد اردو زبان کے تمام شعراء گراں بار ہیں ناسخ پورے ہندوستان پر چھا گیا تھا اور اس کے حریف بھی اس کا اثر لئے بغیر نہ رہے۔"

آغا محمد باقر[2] لکھتے ہیں۔

"عربی فارسی الفاظ اور ترکیبوں کو رواج دیا۔"

صاحبِ تذکرۂ گلستانِ بیخزاں لکھتے ہیں۔

"شاعر[3] والا احترام گویا ہے بلند مقام جس کا اعتقاد راسخ ہے وہ معتقدِ

۱؎ نگار جون ۳۸ء ۲؎ تاریخ نظم و نثر اردو ۳؎ گلستانِ بیخزاں

ناسخ ہے شیخ کا کلام ہے اعجاز کا کلام ہے"
صاحب تذکرۂ گلستانِ سخن لکھتے ہیں۔
"سخن شیخ[1] بے عدیل ونظیر اس کی فکر سے معنی کو تاب و بقا اس کی زبان سے الفاظ کو رونق وضیا ذہن کی صفائی بوسعت رخانِ غیب کا آئینہ قلم کا شگاف ارباب کشف کا سینہ رسائی فکر گوہر وحی صندوقِ سینۂ جبریل سے تاراج کر لیتی تھی۔
نواب مصطفٰے[2] خاں شیفتہ لکھتے ہیں۔
"نسیم چمنِ طبع نکہت ریز شمیم گلِ فکرش دل آویز طائر بلند پرواز عدرش جز بشاخ سدرۂ آشیاں نہ سازد و مرغ تیز بالِ خیالش جز بیام فلک جلوہ نیندازد والا مایہ گرامی پایہ، بلند اندیشہ نازک خیال است و در تلاشِ مضمون تازہ و معنی سیراب بے مثل امثال"
مرزا غالب فرماتے ہیں۔
"شیخ امام[3] بخش ناسخ طرز جدید کے موجد اور پرانی ناہموار روشوں کے ناسخ تھے"
میں خیال کرتا ہوں کہ یہاں اس امر کا اظہار بھی بے موقع نہ ہوگا کہ بعض اشخاص ناسخ کی بعض تشبیہات وغیرہ کے متعلق لکھتے ہیں کہ کوہ کندن وکاہ برآوردن ہے یہ بیان ایک حد تک صحیح ہے لیکن کثرتِ کلام وکثرت تشبیہات واستعارات وکثرت محاسن کے مقابلہ میں ایسی دو چار مثالوں کا ذکر کرنا انصاف کا خون کرنا ہے بعض جگہ تشبیہات کو قریب الفہم کرنے میں ایسی صورت اختیار کرنی پڑی ہے کہ تشبیہہ بھپتی سا معلوم ہوتی ہے ایسے موقع پر یہ صنا عی قابلِ داد ہے نہ کہ لائق ذم ہے۔ مرزا غالب کے یہاں بھی کوہ کندن وکاہ برآوردن کی مثالیں ہیں اور

---

[1] گلستانِ سخن [2] گلشنِ بے خار [3] عودِ ہندی

غیر مقبول تشبیہات بھی ہیں۔

آتش

پروفیسر آزاد لکھتے ہیں۔

"جو کلام اُن کا ہے[1] حقیقت میں محاورہ اردو کا دستور العمل اور انشاء پردازی ہند کا اعلیٰ نمونہ ہے"

مولوی عبدالسلام ندوی لکھتے ہیں۔

"اُن کی زبان[2] نہایت صاف اور شستہ ہے اشعار رواں بندشیں چست اور مضامین میں شوخی و رنگینی و رعنائی پائی جاتی ہے — ایک عام خصوصیت تشبیہات کی لطافت آمیز سادگی ہے رندانہ مضامین میں خواجہ حافظ کے جوش اور ان کی سرمستی کا اظہار صرف خواجہ آتش ہی کی زبان سے ہوا ہے — خواجہ آتش نے بے شبہ عمدہ تشبیہات پیدا کی ہیں۔ خواجہ صاحب کے کلام کی ایک موثر خصوصیت یہ ہے کہ اس میں فقیرانہ اور آزادانہ شان پائی جاتی ہے اور چوں کہ وہ خود اسی شان سے زندگی بسر کرتے تھے اس لئے ان کا قال بالکل حال معلوم ہوتا ہے مثلاً وہ توکل و قناعت استغنا و بے نیازی اور فقر و فاقہ کے مضامین کو جس جوش کے ساتھ ادا کرتے ہیں — جب وہ جذبات کی دنیا میں قدم رکھتے ہیں تو اُن کی شاعری عشق و محبت کے رموز و اسرار کا آئینہ بن جاتی ہے — اس فقیرانہ شان نے اُن کے کلام میں مردانگی کے جوہر پیدا کئے ہیں جس کا اظہار وہ نہایت جوش کے ساتھ کرتے ہیں — خارجی مضامین یعنی خال و خط اور رخ و گیسو کی

---

[1] آبحیات [2] شعر الہند حصہ اول

تعریف ہے اگرچہ ان کا کلام بکھرا ہوا ہے تاہم وہ اپنے طرزِ ادا سے ان مضامین کو بھی بہت دلچسپ اور لطیف بنا دیتے ہیں"[1]

شہزادہ قادر بخش صابر لکھتے ہیں۔

"مضامینِ شوخ اُس کے الفاظِ پاکیزہ میں متمکن جیسے آئینہ میں سیماب اور معانی رنگین اس کی عبارت میں جاگزیں جیسے مینا میں شراب نکتہ ہائے برجستہ اور اشارات دورِ اور زبان پاکیزہ اور عبارت شستہ اور رنگین معنی اور شوخیِ مضمون اور غرابتِ تشبیہہ اور تازگیِ طرز اک بزم میں ہنگامہ آرا"[2]

شاہ نصیر

پروفیسر آزاد لکھتے ہیں۔

"انھیں اپنی نئی تشبیہوں اور استعاروں کا دعویٰ تھا اور یہ دعویٰ بجا تھا"[3]

مولوی حکیم عبدالحی لکھتے ہیں۔

"کلام میں شکوہِ الفاظ کے ساتھ نئی نئی تشبیہیں اور استعارے پائے جاتے ہیں زمینیں بھی نئی نئی نکالی ہیں جس میں شعر کا سرسبز کرنا ہر کسی کا کام نہیں"[4]

شیخ مصحفی نے لکھا ہے۔

"قوتِ شاعری بسیار پیدا کردہ"[5]

شہزادہ قادر بخش صابر لکھتے ہیں۔

"بیشتر تشبیہہِ نو اور استعارہ جدید بہم پہنچانے میں مصروف رہتا ہے

۱؎ گلستانِ سخن ۲؎ آبحیات ۳؎ گلِ رعنا ۴؎ تذکرہ شیخ مصحفی ۵؎ گلستانِ سخن

اور شعر صائب کے طرز پر کہتا ہے۔ بلندی تلاش سے مشاعرہ میں کسی کی غزل کو اس کی غزل پر تفوق نہ ہوتا تھا۔ سنگلاخ زمینوں کو دعویداران کمال میں سے اُس کے سوا کوئی بھی سپر نہ کر سکا۔

شمس العلماء اثرؔ اور مولوی عبدالسلام ندوی لکھتے ہیں۔

"ان کے کلام[1] میں جا بجا جذبات و روحانیات کی آمیزش بھی موجود ہے۔ شاہ نصیر بھی ناسخ کی طرح جا بجا اصلاحی دعوے کرتے ہیں اور اس کو تمثیل کے ذریعہ سے ثابت کرتے ہیں۔"

ذوقؔ

حکیم عبدالحی صاحب بحوالہ تذکرہ طور کلیم لکھتے ہیں۔

"در جمیع اصناف[2] سخن قوتے کہ اور است در ریختہ مرایان نتواں یافت پاکی زبان بلندی و شوخی اشارات و کرسی نشینی ترکیب و نشست قافیہ و نشست ردیف طراز یکتائی دارد — عام جوہر ان کے کلام کا تازگی مضمون صفائی کلام چستی ترکیب خوبی محاورہ اور عام فہمی ہے — ان کی غزل اخیر تو ایک گلدستۂ گلہائے رنگارنگ ہوتی تھی۔ دو تین شعر بلند خیالی کے ایک دو تصوف کے دو تین معاملے کے — ذوقؔ نے نازک خیالی کے ساتھ اچھی تشبیہیں اور استعارے پیدا کئے ہیں اور ان سے بہت زیادہ حکیم مومن خاں اور مرزا غالب نے اس میں کاوش کی ہے اور بعض مقاموں پر جدت سے بھی کام لیا ہے۔"

شمس العلماء اثرؔ لکھتے ہیں۔

"استاد[3] ذوق میں ایک بڑا وصف یہ ہے کہ حضرت اردو کے محاوروں کو

---

[1] کاشف الحقائق جلد دوم و شعر الہند حصہ اول [2] گل رعنا [3] کاشف الحقائق جلد دوم

ایسی آسانی اور روانی کے ساتھ اپنے اشعار غزل میں باندھ جاتے ہیں کہ اہلِ اطلاع کی طبیعت نہایت لذت یاب حیرت ہوتی ہے "

مولوی عبدالسلام ندوی لکھتے ہیں۔

"اکثر محاورات[1] کو اس برجستگی کے ساتھ باندھ جاتے ہیں کہ طبیعت کو نہایت لطف و انبساط حاصل ہوتا ہے۔ ان کے کلام میں تمثیلی مضامین بھی بکثرت موجود ہیں"

ڈاکٹر زور لکھتے ہیں۔

"اگر غالب[2] اور ذوق کا بالمقابل مطالعہ کیا جائے، اور ذوق کے دیوان کا بھی اتنا ہی انتخاب کیا جائے جتنا غالب کے کلام کا ہے تو ہم آسانی کے ساتھ اس نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں کہ ذوق نے فلسفۂ فطرت اور دیگر شعراء اور غالب سے کچھ کم روشنی نہیں ڈالی ۔۔ ان کے کلام کا ایک سرسری مطالعہ بھی اس امر کی شہادت دیتا ہے کہ وہ (ذوق) علومِ متداولہ سے کافی طور پر واقف تھے۔ طب، قانون، رمل، جفر، نجوم، ہیئت، ہندسہ، ریاضی، منطق، فلسفہ، تصوف، غرض متعدد علوم و فنون کی اصطلاحات و مسائل اور نکلیئے ان کے اشعار میں جا بجا نظر آتے ہیں اور جہاں کہیں ان کا ذکر ہے اس قدر گہری معلومات کا اظہار کیا ہے کہ فوراً یہ خیال قائم ہو جاتا ہے کہ غالباً وہ اس فن کے مخصوص ماہر کامل ہیں"

پنڈت چکبست لکھتے ہیں۔

"اعلیٰ درجہ[3] کے اردو شعراء کا یہ دستور رہا ہے کہ ان کا طائرِ فکر حسن و عشق کے محدود قفس سے نکل کر ان روحانی جذبات اور خیالاتِ عالی کے طبقے میں اکثر گرم سیر رہا ہے جہاں نفس پرستی اور عیش پسندی کا پرندہ پر

---

[1] شعر الہند حصہ اول [2] روحِ تنقید حصہ دوم ص ۹۱ [3] مضامین چکبست ص ۱۰۲ انڈین پریس الٰہ آباد سنہ ۱۹۲۱ء

نہیں مار سکتا۔ آتش، ذوق وغیرہ نے بے ثباتی دنیا، توکل، عجز و نیاز بلند نظری، عالی حوصلگی، قناعت، دردِ دل و سوز و گداز اور تصوف وغیرہ کے مضامین شاعرانہ لطافت کے ساتھ نظم کئے ہیں۔"

نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ لکھتے ہیں۔

"جامۂ سحر بیانی بہ بالائش راست و دامن آتش زبانی از بادِ نفسش شعلہ افزا است رنگینی مقابلش جلوۂ لالہ و گل بنظرمی افزاید و شمع فکرش پروانہ وارمی رباید — قوتِ مشقے کہ او راست دیگرے را دیدہ نہ شد رطب و یابس کہ شیوۂ بسیار گویاں است در کلامش کمتر و بر جمیع اصنافِ سخن قدرت تمام دارد۔"[1]

شہزادہ قادر بخش صابر لکھتے ہیں۔

"بلندئی سخن کو آسمان سے دعوی برابری شیرینی طرز کو قند سے کلمۂ ہمسری قلم کے زور سے ضرب المثل کو طمانچہ رستم کی توانائی — ہجوم قافلہ معنی سے ہر بیت میں معنی کثیر، منزل گزیں اور کثرت ورود مضامین سے ہر مصرع میں مضامین متعدد گوشہ نشین۔"[2]

مومن

نواب شیفتہ لکھتے ہیں۔

"بقوتِ شاعری ایشاں کم برخاستہ در ہر جنس آں چناں قوتے دارد کہ کسی را در یک صنعت میسر نہ شد۔"[3]

حکیم عبدالحی لکھتے ہیں۔

"دل فریبیاں مومن خاں کے اردو کلام کے ساتھ مخصوص ہیں۔ رعنائیں[4]

---

[1] گلشن بے خار [2] گلشن سخن [3] گلشن بے خار [4] گل رعنا۔

اور نزاکتیں پیدا کیں۔ مولانا حالی نے یادگارِ غالب میں ایک موقع پر تسلیم کیا ہے کہ مومن خاں مرحوم اس خصوصیت میں مرزا سے سبقت لے گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ مومن خاں نے جس قدر اسالیب بیان میں نزاکت و لطافت پیدا کر دی ہے وہ اُن کی ذہانت اور جولانیٔ طبع کا تماشاگاہ ہے قصیدوں میں غزلوں میں ہر جگہ ان کا اندازِ بیان کیفیت سے خالی نہیں۔"

پروفیسر آزاد لکھتے ہیں۔

ان[۱] کے خیالات نہایت نازک اور مضامین عالی ہیں اور استعارہ اور تشبیہ کے زور نے اور بھی اعلیٰ درجہ پر پہنچایا ہے۔۔۔ اکثر عمدہ ترکیبیں اور نادر تراشیں فارسی کی اور استعارے اور اضافتیں اردو میں استعمال کر کے کلام کو نمکین کرتے ہیں۔"

مولوی عبدالسّلام ندوی لکھتے ہیں۔

"نہایت[۲] متانت اور تہذیب کے ساتھ عشق و ہوس کے جذبات ادا کئے ہیں۔ انھوں نے جہاں صفائی اور روانی کے ساتھ معاملہ بندی کی ہے وہاں بھی وہ جادۂ تہذیب سے الگ نہیں ہوئے۔"

پروفیسر کلیم الدین لکھتے ہیں۔

"مومن[۳] معانی آفرینی میں کاوش کرتے ہیں وہ تراکیب نو کا اختراع بھی کرتے ہیں۔ اکثر ترکیبیں دلنشین ہوتی ہیں۔ مومن کی غزلوں میں وہ ناہموار نہیں جو غالب کے کلام میں ملتی ہے۔۔۔ مومن میں میر کا عکس نظر آتا ہے۔"

نیاز فتحپوری لکھتے ہیں۔

"اگر[۴] اردو کے تمام شعراء متقدمین و متاخرین کے کلام رکھ کر مجھ کو صرف

[۱] آبحیات [۲] شعر الہند حصہ اول [۳] اردو شاعری پر ایک نظر ص۲۴ [۴] انتقادیات حصہ اول مطبوعہ عہد آفریں پریس حیدرآباد دکن ۱۹۴۴ء صفحات ۲۱، ۲۶، ۲۹، ۳۲، ۴۴، ۴۹

ایک دیوان حاصل کرنے کی اجازت دی جائے تو میں بلا تامل کہدوں گا کہ مجھے کلیاتِ مومن دیدو --- بلندی کا یہ عالم ہے کہ غالب کی انتہائی پرواز بھی اس کی فضا تک نہیں پہنچ سکتی --- میرے خیال میں مومن ہی ایک ایسا شاعر ہے جو نفسیاتی رموز کو سمجھ کر شاعری کرتا ہے اور ایسی معنوی نزاکتیں پیدا کرتا ہے کہ غور سے تجزیہ کرنے کے بعد ان کا پتہ چلتا ہے مومن فارسی ترکیبیں استعمال کرنے میں خاص ملکہ رکھتے ہیں اور اس باب میں جو چیز انھیں غالب سے ممتاز کرتی ہے وہ ترکیبوں کی نزاکت ہے غالب کی فارسی ترکیبوں میں اشکال لفظی کے ساتھ دقتِ معنی بھی ہے اور مومن کے ہاں ترکیبوں کے مطلب کے ساتھ مفہوم وسیع ہوتا جاتا ہے۔ ان کا یہ رنگِ تغزل گہرا تھا۔ ان کی کلیات میں علاوہ غزل کے قصیدہ تضمین، ترجیع بند، تخمیس، قطعات، رباعیات، تاریخیں اور معمے بھی نظر آتے ہیں اور سخت سے سخت نقاد بھی ان کو کسی جگہ گرا ہوا ثابت نہیں کر سکتا۔

نیاز فتحپوری لکھتے ہیں۔

"حکایتِ عشق[۵] کی دلدوز کیفیتیں مومن کے یہاں زیادہ پائی جاتی ہیں اور غالب کے یہاں کم۔ اس ہی کے ساتھ ایک فرق یہ بھی ہے کہ غالب کے کلام میں جتنی ثقیل اور ناگوار ترکیبیں پائی جاتی ہیں اتنی کلام مومن میں نہیں ہیں جو نہ ہونے کی برابر ہیں۔"

مولانا عارف ہسوی لکھتے ہیں۔

"مومن[۶] کے کلام کی خصوصیت اسالیبِ بیان کی ندرت اور نازک خیالی ہے پہلی خصوصیت میں ایک حد تک سودا مگر سودا سے زیادہ غالب

---

۵ مجموعہ استفسارات جلد سوم ص۴۷ ۶ حکیم مومن خاں ص۲ محبوب المطابع دہلی

مومن کے شریک ہیں مگر یہ واقعہ ہے کہ مومن نے اس کثرت سے ادائے مفہوم کے لیے نئے نئے اسلوب اختراع کیے ہیں کہ اس باب میں غالب مومن سے بہت پیچھے رہ گئے۔

نواب صدیق حسن خاں صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

"شاعر[1] قابل بود ہمیشہ پری زادان معانی را بدام خیال صید می کرد و سخن در فارسی و ریختہ ہر دو می سرائید، از شعرائے نامور شاہجہان آباد و صاحب استعداد خداداد است۔"

شہزادہ قادر بخش صابر لکھتے ہیں۔

"خامہ[2] اس کے سوزِ معانی سے نخل طور اور ورق اس کی فروغِ مضامین سے مطلعِ نور مصرع آہ اس کی غزل عاشقانہ ہیں تضمین اور رہ اسرار یقین اس کی، بیاتِ عاشقانہ میں گوشہ گزیں سخن سنجانِ عصرِ جدید بالادستی فکر سے عرش تاز تھے لیکن جو کہ یہ والا نگاہ اپنی ہمت عالی کے اوج سے سب کے احوال پر نگاہ کرتا تھا ہر میر بلند اس کو پست اور ہر بزرگ اس کو خورد نظر آتا تھا۔"

مسٹر غلام[3] ربانی عزیز لکھتے ہیں۔

"بعض غزلیات بہت ہی پرلطف و بامزہ ہیں بڑی بحروں کی، لیکن چھوٹی بحروں میں جو غزلیات لکھی گئی ہیں، ان میں مشکل ہی سے کوئی غزل ایسی ہوگی جس میں دو چار تڑپا دینے والے اشعار نہ ہوں۔"

مرزا غالب مومن کو خود بھی بڑا صاحب کمال سمجھتے تھے مومن کی وفات پر انھوں نے ایک رباعی لکھی تھی اس کا ایک شعر یہ ہے۔

کافر باشم اگر بمرگ مومن چون کعبہ سیہ پوش نباشم ہمہ عمر

۱؎ شمع انجمن شاہجہانی پریس بھوپال ۱۲۹۳ھ ۲؎ گلستانِ سخن ۳؎ نگار مارچ ۱۹۲۷ء

مظفر شاہ خاں صاحب ایم اے لکھتے ہیں۔

"حقیقت یہ ہے کہ ان کی (غالب) نازک خیالی اور بلند پروازی کی تاب عاشقانہ شاعری نہ لا سکی۔ اسی باعث ان کا کلام ان کے معاصرین مومن اور ذوق کے مقابلہ میں فروغ نہ پا سکا اس سلسلہ میں سب سے پہلی چیز ان کے کلام کی بے سوزی وبے کیفی ہے۔
ان کی جدت پسندی مذاقِ عامہ کا ساتھ نہ دے سکی۔

اس ماحول کی طبائع ذوق کی سادگی روانی محاورہ اور روزمرہ سے آراستہ شاعروں کو پسند کرتی تھیں ان کو مومن کا گہرائی آفریں روح کی گہرائیوں تک اتر جانے والا تغزل مطلوب تھا جس میں معاملہ بندی کے ایسے حسن کارانہ اسالیب موجود ہوں کہ سوقیت سے کوئی رابطہ نہ ہو مومن کے یہاں نازک خیالی کے باوجود ان کا تغزل ندرت تخیل نادرہ اور دور دراز کار تشبیہات کے پردوں میں چھپا ہوا نہیں ہے۔

دیگر اساتذہ

رندؔ، صباؔ، وزیرؔ کے متعلق پروفیسر آزاد لکھتے ہیں۔

"شاعری کا پورا پورا حق ادا کر دیا"

تلامذۂ ناسخ و آتش کے متعلق مولوی عبد السلام ندوی لکھتے ہیں۔

"غزل میں تغزل کا رنگ پیدا کیا۔ آغا جو شرف کے دیوان میں تغزل کا کافی رنگ موجود ہے اور عاشقانہ شاعری کے تمام لوازم پورے طور پر پائے جاتے ہیں۔

انیسؔ و دبیرؔ بھی اس ہی دور کے اساتذہ میں سے ہیں۔ ان کی بلند خیالی تشبیہات

لہ برہان جنوری ۲۲ء ۲ہ آبِ حیات ۳ہ شعر الہند حصہ اول۔

و استعارات کی نزاکت و لطافت فارسی، الفاظ و محاورات و تراکیب کے استعمال کی دنیائے ادب میں دھوم ہے۔ خواجہ حالی شاگرد غالب لکھتے ہیں۔

رباعی

اردو رواج چار سو تیرا ہے — شہروں میں راج کو بکو تیرا ہے
پر جب تک یہ انیس کا سخن باقی ہے — تو لکھنؤ کی ہے لکھنؤ تیرا ہے

تمام مبصرین کے بیانات پر غور کرنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ نازک خیال تشبیہات و استعارات کی کثرت و لطافت، جدت طرازی فارسی الفاظ و محاورات و تراکیب کا استعمال اس دور کے تمام اساتذہ کے یہاں ہے اور کثرت سے ہے لیکن الفاظ و محاورات کی صحت، قواعد و ضوابط کا لحاظ جو دیگر اساتذہ کے یہاں ہے وہ مرزا غالب کے کلام میں نہیں۔ دوسروں نے نازک خیالی، جدت طرازی، تشبیہات و استعارات کو صحت و صفائی زبان کے ساتھ نبھایا ہے مرزا صاحب نے کہیں گنجلک ڈالدی ہے کہیں دائرہ قوانین سے باہر قدم رکھا ہے۔ کہیں نامانوس زبان کا استعمال کیا ہے دوسروں کے یہاں تقریباً تمام اصنافِ سخن موجود ہیں اور ان کا کلام بھی کثیر تعداد میں ہے۔ مرزا صاحب کے یہاں تمام اصنافِ سخن بھی نہیں کلام بھی قلیل تعداد میں ہے اور جو ہے اس میں سے بھی ایک چوتھائی حصہ کو صحیح کلام کہا جا سکتا ہے۔ تغزل، آتش و تلامذہ آتش و مومن کے یہاں زیادہ ہے۔ صحت و درستی زبان کے مالک ناسخ ہیں۔ محاورات کی سلطنت پر ذوق کی حکومت ہے۔ جوش، سرمستی، سوز و گداز آتش و مومن کا حصہ ہے۔ فارسی تراکیب و محاورات کا استعمال مومن نے نہایت خوبی سے کیا ہے۔ تشبیہہ و استعارات کی بلندی و نزاکت و لطافت انیس و دبیر کے یہاں سب سے زیادہ ہے۔

دیگر اساتذہ کے کلام میں تمام محاسن اور تمام اقسام کے مضامین ہیں۔

اخلاق، تصوف، فلسفیانہ مضامین عشق و محبت، درد و الم معشوق کے خارجی و داخلی اوصاف غرض سب کچھ موجود ہے اور افراط سے ہے۔

مرزا غالب کے متعلق متفرق بیانات ہیں بعض ناقدین کی رائیں نقل کی جاچکی ہیں ایک دو رائیں نقل کی جاتی ہیں۔ نیاز فتحپوری لکھتے ہیں۔

"غالبؔ اس گویئے کی طرح ہیں جس کی خوش گلوئی اُسے ہر رنگ میں کامیاب کر کے دکھا دیتی ہے حالاں کہ وہ ماہر کسی کا نہیں ہے یا صرف ایک چیز کا ہے"[۱]

درحقیقت مرزا غالب حسرت و یاس درد و غم شراب و کباب کے مضامین لانے میں اعلیٰ درجہ کے صاحب کمال ہیں۔ پروفیسر رشید احمد لکھتے ہیں۔

"غالبؔ کی شاعری ایک حد تک صرف ہائے ہو اور نا و نوش کی ترجمانی ہے"[۲]

پروفیسر حامد حسن قادری نے لکھا ہے۔

"مرزا غالبؔ گنہگاروں کے شاعر ہیں"[۳]

قادری صاحب کا یہ قول بالکل صحیح ہے مرزا صاحب نے ہجر و الم شراب و کباب کے مضامین کو جوش و خروش کے ساتھ ادا کیا ہے مگر اکثر اشعار میں صفائی اور صحت کو ملحوظ نہ رکھ سکے۔ دیگر اقسام کے مضامین کو وہ خوبی کے ساتھ ادا نہیں کر سکے تصوف جو اردو شاعری کی جان ہے اس کے متعلق مرزا کے دو ہزار اشعار میں کم و بیش پندرہ شعر ہیں اور ان میں سے عمدہ شعر تین چار ہیں۔ اخلاقی مضامین جن کو ابتدا سے لے کر آج تک تمام اساتذہ غزل میں لاتے رہے ہیں اور جن کو دور پنجم کے تمام اساتذہ نے نہایت جوش و خروش کے ساتھ شگفتہ بحروں میں عمدہ تمثیلوں سے صاف زبان، صحت بیان سے ادا کیا ہے جن کے پڑھنے اور گنگنانے پر اکثر آدمیوں کو رغبت ہوتی ہے اور

---

[۱] مجموعہ استفسارات جلد دوم ۱۹۳۶ء ص ۳۶ [۲] تنقیدات عبدالحق ص ۸۰ [۳] نقد و نظر ص ۱۲۱

ان کا بار بار زبان پر آنا ان کے فوائد کو عام و مستحکم کرتا ہے۔ مرزا نے اس کے متعلق صرف دس شعر لکھے ہیں۔ ان میں سے چار تو ایسے ہیں جو بھکاری فقیروں کی صدا میں کار آمد ہو سکتے ہیں۔

ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا
اور درویش کی صدا کیا ہے

بعض بیہودہ ہیں جن کو عام طور پر سمجھنے میں دشواری پیدا ہوتی ہے۔ ایسے شعروں کو کون دلچسپی سے پڑھتا ہے اور جب وہ بار بار زبانوں پر نہ آئے تو فائدہ معلوم۔

حالی لکھتے ہیں[1]۔

" اگرچہ مرزا غالب کی شاعری نے شعرائے متوسطین کے حدود دائرے سے قدم باہر نہیں رکھا وہی چند میدان جن میں انھوں نے گھوڑے دوڑائے ہمیشہ مرزا کے جولانگاہ رہے ہیں۔"

پروفیسر کلیم الدین احمد لکھتے ہیں[2]۔

" غالب نے غزل کے نقائص کو رفع نہیں کیا، میر درد کی طرح ان کا کوئی خاص انداز نہیں۔"

مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں[3]۔

" مرزا غالب کی اصلی خصوصیت ان کے محاسنِ معنوی ہیں نہ کہ مجرد لفظی، فارسی الفاظ و تراکیب پس لفظی۔ اس کی ہونی چاہیے نہ کہ محض الفاظ کی، معہذا غالب کے کلام کا بہترین حصہ وہ ہے جس میں فارسی ترکیبیں باعتدال مستعمل ہوتی ہیں۔"

---

[1] یادگار غالب مطبوعہ مفید عام پریس علی گڑھ طبع دوم ص ۳۸۴

[2] اردو شاعری پر ایک نظر [3] لکھنؤ کا دبستانِ شاعری مصنفہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ص ۵۹۶ نیز ملاحظہ ہو گل کدہ۔

وجوہ پسند

اس زمانہ میں مرزا غالب کو جن وجوہ سے پسند کیا جاتا ہے ان کا بھی اظہار ضروری ہے۔

۱۔ حالی اور ڈاکٹر بجنوری اور بعض بڑے درجہ کے ڈگری یافتہ اصحاب کی موافقت کا شوق جس کا دوسرا نام بھیڑ اچال ہے۔

۲۔ قسم قسم کے نکات اور مضامین پیدا کرنے کے لیئے اور اپنی طباعی وجلیت کے اظہار کے لیئے ایسے کلام سے بہتر کوئی کلام نہیں مل سکتا جو پیچیدہ اور ژولیدہ ہو مہمل ہو یا مہمل کے قریب ہو۔

۳۔ باوجود جد وجہد، قیل وقال، بحث وتجسس کے ملک کا مذاق نہیں بدلا ہے۔ وہی شعر پسند کیا جاتا ہے جس میں شراب وکباب کا چٹخارا ہو یا حسن وعشق فراق ووصال کے مضامین ہوں۔ پروفیسر کلیم الدین لکھتے ہیں۔[له]

"لیلیٰ مجنوں کا عشق، فرہاد کی کوہ کنی، گل وبلبل کی رنگین حکایت شمع وپروانہ کا راز ونیاز، حسن یار کی برق افروزی، صبا کا شکوہ عاشق کی وفا کی تعریف، یہ مضامین کچھ ایسے دل پذیر ہوئے کہ ابھی تک بھی ان سے جدائی گوارا نہیں۔ زلفِ مشکیں، خال سیہ، نرگس، چاہ ولؤلوئے مژگاں، لب لعلیں، دُر دنداں، چاہِ زنخداں کا کہاں ذکر نہیں"

ایک شاعر نے خوب لکھا ہے۔

ساقی نامہ کہنے والوں کی نہیں اب بھی کمی
اب بھی ہے ذہنی تعیش کا ذریعہ شاعری

[له] اردو شاعری پر ایک نظر له اخبار ہماری زبان دہلی یکم اپریل ۱۹۴۵ء

مانگ ہے اب بھی رکیک و مبتذل اشعار کی
بزم شعر اب بھی حریفِ محفلِ رندانہ ہے

۴۔ رندی و ہوسناکی کے مضامین کے علاوہ غالب کی اکثر غزلیں گانے بجانے میں بہت کار آمد ہیں۔ پسندِ عام ہیں اس صفت کو بڑا دخل ہے۔ ڈاکٹر بجنوری لکھتے ہیں۔

"مرزا غالب[۱] کے لئے شاعری موسیقی اور موسیقی شاعری ہے۔ غالب کے شعر کی موسیقی کی خوبی بلا امدادِ سازو ترنم کے ترتیل سے دریافت ہو سکتی ہے۔"

۵۔ الفاظ و بندش کے شکوہ سے اکثر لوگ مرعوب ہو جاتے ہیں۔ ان کو درستیِ معنی و مطلب اور صحیح و سقیم سے غرض نہیں۔

۶۔ مرزا غالب کا کلام تعداد میں قلیل ہے اور اس میں رندی و آلام کے مضامین کثرت سے ہیں اور ایسی بحریں ہیں جو موسیقی میں خوبی سے سما سکتی ہیں دیگر اساتذہ کے یہاں بھی یہ خوب ہیں اور غالب سے زیادہ ہیں مگر ان کے کثیر کلام اور گوناگوں مضامین ہیں سب خلط ملط ہیں جن کو غور و تفحص سے صاحبِ نظر برآمد کر سکتا ہے۔ ناسخ کے دواوین کے متعلق مولوی عبدالسلام ندوی لکھتے ہیں۔

"غرض ان[۲] کے منتخب کلام میں خواجہ آتش کی تمام خصوصیات موجود ہیں لیکن یہ تمام پھول خس و خاشاک کے ڈھیر میں اس طرح گم ہو گئے ہیں کہ دنیا ان کے رنگ و بو سے بالکل ناآشنا ہے۔

مومن کے متعلق نیاز فتحپوری لکھتے ہیں۔

---

[۱] رسالہ اردو اورنگ آباد دکن جنوری ۱۹۲۱ء صفحہ ۱ و ۲ مضمون محاسن کلام غالب

[۲] شعر الہند حصہ اول صفحہ ۲۴۰

"اگر[۱] ان کی کلیات کا استقصا کیا جائے تو باندک تفاوت کئی دیوان غالب نکل سکتے ہیں۔"

مرزا غالب کو ان کی حیات میں بھی لوگ اہلِ کمال میں شمار کرتے تھے اور ان کے کلام سے ذوق رکھتے تھے اس کے دو سبب تھے ایک تو یہی کہ مذاق بگڑا ہوا تھا؟ دوسرے یہ کہ مرزا فارسی کے زبردست شاعر تھے اور اس زمانے میں فارسی گو شعرا اردو کے شعراء سے افضل سمجھے جاتے تھے تیسرے یہ کہ ان کا اردو کلام وہی پسند کیا جاتا تھا جس کو اہلِ نظر اب بھی پسند کرتے ہیں اور مرزا بھی اپنے اسی قدر کلام کو قابلِ پسند سمجھتے تھے۔ یہ امر اس انتخاب سے ثابت ہے جو مرزا صاحب نے خود نواب کلب علی خاں والیِ رام پور کے لئے کیا تھا۔ اس انتخاب میں جو کلام ہے اس میں بہت کم اشعار ایسے ہیں جس پر کچھ کلام کیا جاسکتا ہے اور کثرت سے ایسے اشعار ہیں کہ اشد سے اشد ناحق کوش بھی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا اور وہ سب اشعار نفسانی جذبات کے مضامین سے پر ہیں۔ اس قلیل کلام کے علاوہ جو ان کا کلام ہے اس کو کبھی کسی نے پسند نہیں کیا اور اس پر ہمیشہ طعن و طنز ہوتے رہے ان میں اس قسم کے کلام کی حقیقت یہ ہے کہ الفاظ خوبصورت ہیں۔ بندش چست ہے مگر حقیقت و معنی سے عاری ہیں جیسے مرزا کا یہ شعر

پا بدامن ہو رہا ہوں بسکہ میں صحرا نورد
خارِ پا ہیں جوہرِ آئینۂ زانو مجھے

اس کے متعلق شمس العلماء پروفیسر عبدالرحمن لکھتے ہیں۔

"[۲]معنی کچھ بھی نہیں دوسرے مصرعہ سے صحرا نوردی میں پا بدامن ہونے کا ثبوت دیا ہے جو بظاہر محال ہے لیکن شعر بندشِ الفاظ اور حسنِ ادا کی بدولت ایک شان دکھا رہا ہے۔"

۱ے مجموعہ استفسارات جلد دوم ص۲۲۵ ۲ے مرأۃ الشعراء ص۲۱۲

مرزا صاحب کے اس قسم کے کلام کی ایسی مثال ہے کہ ایک کانا گنجا لنجا آدمی ہے جو لباس فاخرہ پہنے ہوئے ہے۔[1]

اس کے علاوہ شعر کے حُسن و قبح کا فیصلہ کسی کی پسند نا پسند پر نہیں ہو سکتا کیوں کہ مذاق مختلف ہوتے ہیں۔ اپنی اپنی پسند ہے۔ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ صاحب گلشن بے خار کو ناسخ کے کلام میں زیادہ تیز نشتر نظر آئے مرزا غالب کو آتش کے کلام میں۔ پروفیسر مولانا شمس العلماء عبدالرحمٰن دہلوی لکھتے ہیں۔

"مسموع و مقبول و طرب انگیز رقص آور اشعار کا امتیاز اور تعین محض مذاق سے تعلق رکھتا ہے اور مذاق ہوتے ہیں مختلف اس لیے حسن و احسن مقبول و مسموع اشعار کے باب میں اکثر اختلاف ہو جاتا ہے ایک شعر ایک کے لئے رقص آور ہوتا ہے مگر دوسرا اس کو ٹس سے مس بھی نہیں ہوتا"[2]

اس لئے شعر کا حسن و قبح معلوم کرنے کے لئے صرف قواعد لسان و ضوابط فن ایسی کسوٹی ہیں کہ جس میں کسی کو چون و چرا کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔

غالب کے متعلق ہمعصر فضلاء و شعراء کا خیال

علامہ مفتی صدرالدین آزردہ دہلوی مرزا کے طرز کو ناپسند کرتے تھے اور ان کے کلام کو سن کر اکثر الجھتے تھے۔

دہلی کے مشہور سخنور حکیم آغا خاں عیش نے ایک مشاعرہ میں مرزا کو مخاطب کر کے یہ رباعی پڑھی تھی۔[3]

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے
مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے

---

[1] مرأۃ الشعر [2] بیانِ غالب ص۲۵۱ وگلِ رعنا ص۳۱۲
[3] آبحیات ذکر غالب۔

کلامِ میر سمجھے اور زبانِ میرزا سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

بادشاہ کے دربار میں ایک سخرا شاعر تھا ہُدہُد تخلص کرتا تھا وہ جب کبھی مہمل شعر لکھتا تو کہدیتا کہ یہ مرزا غالب کے طرز میں ہیں ایک شعر نمونہ کے طور پر لکھتا ہوں۔[1]

مرکزِ محورِ گردوں بہ لبِ آب نہیں
ناخنِ قوسِ قزح شبہ مضراب نہیں

مولانا عبدالقادر رام پوری ایک فاضلِ اجل اور سخن سنج تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے مرزا سے کہا کہ آپ کے اس شعر کا مطلب سمجھ میں نہیں آتا۔[2]

پہلے تو روغنِ گل بھینس کے انڈے سے نکال
پھر دوا جتنی ہے کل بھینس کے انڈے سے نکال

ابوعزیز حکیم غلام غوث لکھتے ہیں۔

"حالی نے یادگارِ غالب میں لکھا ہے کہ مرزا غالب کے زمانے میں لوگ مشاعرہ میں ایسے شعر کہہ کر لاتے تھے کہ الفاظ مناسب خوبصورت ترکیبیں پُرشوکت مگر معنی ندارد، گویا اس طرح یہ مرزا پر تعریض کرتے تھے"[3]

موازنہ

مرزا غالب کے ہمعصر شعرا ناسخ، آتش، انیس، دبیر، ذوق، نصیر، مومن وغیرہ سے مرزا غالب کا موازنہ کرنا سخت غلطی ہے۔ موازنہ ان شخصیتوں میں ہوتا ہے کہ جن کے حالات قریب قریب ہوتے ہیں اور جن میں بعد المشرقین ہو ان میں موازنہ نہیں ہو سکتا۔ دورِ نجم کے تمام اساتذہ کی کیفیت یہ ہے کہ ان کے کلام

---

[1] آبحیات [2] گلِ رعنا حاشیہ صد ۳۱۲ [3] رسالہ خیابِ اردو لاہور مئی ۱۹۲۱ء

کی تعداد زیادہ ہے۔ ان کے کلام میں اس قسم کی بعض غلطیاں ہیں جن کو محاسنِ کثیر کے مقابلہ میں کالعدم سمجھا جاتا ہے۔ وہ مسلم الثبوت استاد اور ماہرِ فن اور مصلحِ زبان تھے۔ ان کو زبان وفن پر پوری قدرت حاصل تھی۔ وہ صاحبِ طرز تھے۔ برخلاف ان کے مرزا غالب کا نہ کوئی خاص طرز تھا نہ ان کو زبان پر اس قدرت حاصل تھی کہ نظم میں کما حقہٗ اظہار مافی الضمیر کر سکیں۔ ان کے کلام کی تعداد نہایت قلیل ہے ان کے کلام میں شدید وکثیر اغلاط ہیں۔ ان کی اکثر غزلیات پر نہ اردو کا اطلاق ہو سکتا ہے نہ فارسی کا، ان کے کلام میں مہملات کی تعداد بھی کافی ہے۔ اس لئے اساتذہ مذکورہ سے ان کو کوئی نسبت نہیں پھر موازنہ کیسا، چند اچھے اشعار کا ہونا ان کو اساتذہ کی صف اول میں نہیں کھڑا کر سکتا۔ بقول پروفیسر آزاد نظیر اکبرآبادی کے بعض اشعار میر کے کلام سے پہلو مارتے ہیں تو کیا نظیر کو میر کے مقابلہ پر کھڑا کیا جا سکتا ہے۔ مولوی عبدالحلیم شرر لکھتے ہیں۔

"ایک معمولی شاعر اور بالکل نومشقِ سخن گو کبھی ایسے موثر اشعار لے جاتا ہے کہ جس کے آگے بڑے بڑے اساتذہ کے دیوان مٹ کے رہ جاتے ہیں"[۱]

ایسی صورت میں کیا اس نومشق سخن گو کو اساتذہ کے مقابلہ میں لایا جا سکتا ہے۔ اس وجہ سے مرزا غالب کا ان اساتذہ میں سے کسی سے موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔

ان بزرگوں کے ساتھ مرزا کا ذکر آجانا بھی مرزا کی بڑی عزت ہے۔

بلبل ہمیں کہ قافیہ گل شود بس است

مرزا صاحب کے ایک ربع کلام کی تعریف کی جا سکتی ہے وہی کلام ان کے لئے مایۂ ناز ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ کلام ایسا کلام ہے کہ اس کا تمثیل ونظیر نہیں۔ ایسے اشعار بھی کثیر تعداد میں ان کے معاصرین کے دواوین میں سے نکالے

---

[۱] مضامین شرر

جا سکتے ہیں اور اگر کسی کو موازنہ پر اصرار ہی ہو تو میں کہہ سکتا ہوں کہ اس کتاب میں اس قسم کا کلام موجود ہے جس سے ایک صاحبِ نظر موازنہ کر کے نتیجہ اخذ کر سکتا ہے۔ وہ ہر جگہ صحتِ زبان و قواعد اور صفائی بیان میں ہر ایک کو مرزا سے بڑھ کر پائے گا۔ رفعتِ تخیل و تشبیہات و استعارات میں بھی ان میں سے کوئی مرزا سے پیچھے نہیں ہے ایک سب سے بہتر صورت موازنہ کی یہ ہے جو اس کتاب میں آچکی ہے کہ اساتذہ کے دورِ نجم کے متعلق مبصرین کی رائیں دیکھی جائیں۔ جو رائیں نقل کی گئی ہیں ان میں اہلِ نظر نے ہر قسم کے مضامین تمام اصنافِ سخن صنایع بدائع، زبان، قواعدِ فن، غرض جملہ امور کے متعلق اظہار رائے کر دیا ہے۔ ایسا جامع مقابلہ انصاف پسند کی تشفی کے لیے کافی ہے۔ مرزا غالب اور ان کے معاصرین کی ایسی مثال ہے کہ مرزا غالب کے سامنے دو ہزار اشرفیاں رکھی ہیں جن کی چمک دمک سے عام دیکھنے والوں کی آنکھوں کو چکا چوند لگتی ہے لیکن صاحبِ بصیرت جب غور کرتا ہے تو اس کو معلوم ہوتا ہے کہ ان دو ہزار میں پندرہ سو مغشوش سونے کے سکے ہیں۔ کچھ سکے مرزا کے معاصرین کے سامنے ہیں۔ ان میں سے کچھ مس سکے ہیں کچھ نقرئی، کچھ مغشوش طلائی کچھ خالص طلائی۔ اہلِ نظر جب اس انبار میں سے چننا شروع کرتا ہے تو اس کو نصف انبار سے کھرے سونے کے سکے دستیاب ہو جاتے ہیں۔

املاء

کیفی[1] صاحب نے لکھا ہے کہ مرزا غالب (ذرا) کو (ز) سے لکھتے تھے۔

تمام اہلِ لغت متفق ہیں کہ لفظ (ذرا) عربی لفظ (ذرۃ) سے ہے جس کے معنی ہیں بہت تھوڑا۔ مرزا صاحب کا (ز) سے لکھنا غلط ہے۔

---

[1] کیفیہ ص ۳۵۱

مولوی عبدالحق بھی انہی کے اتباع میں اس طرح لکھتے ہیں۔ معلوم نہیں ان کے پاس اس کی کیا سند ہے۔

کیفی صاحب ہی نے لکھا ہے کہ مرزا غالب (پانوں) کی جگہ (پانو) لکھتے تھے غالباً ان کی تقلید ہی میں ان کے دیوان کی بعض اشاعتوں میں اس غزل میں دوی سادگی سے جان پڑوں کوہ کن کے پانوں (پانوں) کی جگہ (پانو) چھاپا گیا ہے۔

قدماء میں مشہور اساتذہ نے (پانوں) باندھا ہے۔ یا (پاؤں) سب نے اس لفظ کو (ن) غنہ ہی پر ختم کیا ہے۔ پہلے (نون) کو تو بعض نے اڑایا ہے آخر کے (نون) کو کسی نے نہیں اڑایا۔

(قائم) تو کرتا ہے پاؤں سے سر کی تمیز
ہے اپنی جگہ پاؤں سر سے عزیز

(بحر) نافہم لوگ بیٹھے ہیں بن بن کے خاک بحر
محفل سے دھکتے جاتے ہیں اہلِ سخن کے پاؤں

ان کو یہ بھی خیال نہیں رہا کہ (پانو) لکھنے کی صورت میں یہ تمام غزل غلط ہو جائے گی۔

(وی سادگی سے جان پڑوں کوہ کن کے پانوں)

کیوں کہ (پانو) ایک (پیر) کے لئے مستعمل ہوگا۔ اور محاورہ (پانوں پڑوں) (پانوں دھو دھو پیوں) ہے۔ تو یا تو محاورے میں تصرف لازم آئے گا جو السنہ کے اصول کے خلاف ہے یا ردیف کو غلط قرار دینا پڑے گا۔

دہلی کے قدیم اساتذہ (پانوں) ہی لکھتے تھے۔ میر حسن کہتے ہیں۔

لگا پھرنے وہ سرو جب پانوں پانوں
کئے سجدے آزادنے اس کی پاؤں

نام کو پہلے ناؤں بھی باندھتے تھے جو اس شعر میں ہے اگر (پانو) ہو تو (ناؤں) کا قافیہ نہ ہوتا۔

باب سوم

غالب کی شاعری کا روشن پہلو

کمالِ غالب

مرزا غالب کے موجودہ دیوان میں کم وبیش پانچسو اشعار ایسے ہیں جو مرزا کے لئے مایۂ ناز ہیں۔

(۱) مرزا جہاں کہیں صفائی بیان پر آگئے ہیں قیامت ہی ڈھا گئے ہیں۔ ہائے کیا خوب فرمایا ہے۔

رہے اس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے
تکلف برطرف تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی

اے ساکنانِ کوچۂ دلدار دیکھنا
تم کو کہیں جو غالبِ آشفتہ سر ملے

قہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو
کاش کے تم مرے لئے ہوتے

غالبِ خستہ کے بغیر کونسا کام بند ہے
روئیے زار زار کیا کیجئے ہائے ہائے کیوں

وائے دیوانگیٔ شوق کہ ہر دم مجھ کو
آپ جانا اُدھر اور آپ ہی حیراں ہونا[1]

(۲) مرزا غالب نے بعض بعض مضامین کو مختلف طریقوں سے ادا کیا ہے اور خوب ادا کیا ہے۔

---

[1] آگے ان کے اور عمدہ اشعار آئیں گے۔

اُگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ ویرانی تماشا کر
مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا

ہے سبزہ زار ہر در و دیوارِ غم کدہ
جس کی بہار یہ ہو پھر اُس کی خزاں نہ پوچھ

اُگ رہا ہے در و دیوار پہ سبزہ غالب
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

گنجایشِ عداوتِ اغیار اک طرف
یاں دل میں ضعف سے ہوسِ یار بھی نہیں

چھوڑا نہ مجھ میں ضعف نے رنگ اختلاط کا
ہے دل پہ بار نقشِ محبت ہی کیوں نہ ہو

ناکامیِ نگاہ ہے برقِ نظارہ سوز
تو وہ نہیں کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی

نظارہ نے بھی کام کیا واں نقاب کا
مستی سے ہر نگہ ترے رُخ پر بکھر گئی

جب وہ جمالِ دل فروز صورتِ مہرِ نیمروز
آپ ہی ہو نظارہ سوز پردہ میں منہ چھپائے کیوں

وحشتِ آتشِ دل سے شبِ تنہائی میں
صورتِ دود رہا سایہ گریزاں مجھ سے

سایہ میرا مجھ سے مثلِ دود بھاگے ہے اسد

(۳) ایسے بعض وسیع خیالات کو جو متعدد اشعار میں ادا ہو سکتے ہوں مرزا نے ایک ہی شعر میں خوبی کے ساتھ ادا کیا ہے۔

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

ان دو مصرعوں میں اس قدر معانی سمائے ہیں کہ اُن کی تفصیل نہایت پُرلطف ہے۔

(۱) ایک طایر اسیر ہو کر پنجرے میں بند ہو گیا ہے شاعر اس مضمون کو صرف لفظ (قفس) سے ادا کرتا ہے (۲) اس طایرِ اسیر نے باغ میں بجلی گرتے دیکھی اب اس کو یہ پریشانی لاحق ہوئی کہ میرا گھونسلہ بچ گیا یا جل گیا۔ اس مضمون پر لفظ (کل) دلالت کر رہا ہے (۳) ایک آزاد طایر جو اس طایر اسیر کا دوست ہے سامنے ایک درخت پر آ بیٹھا تو اس طایرِ اسیر نے اس سے باغ کی روداد دریافت کی لیکن یہ طایرِ آزاد صاف صاف واقعہ بیان کرتے ہوئے اس لیے ڈرتا ہے کہ اس گرفتارِ بلا کو کس منھ سے یہ خبر سناوں کہ بجلی گرنے کے حادثہ میں تیرا گھر جل کر خاکستر سیاہ ہو گیا۔ اس تمام مضمون کو (مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم) یہ جملہ ادا کر رہا ہے (۴) یہ طایرِ اسیر خود ہی اپنے دل کو تسلی دیتا ہے کہ چمن میں ہزاروں آشیانے ہیں کیا میرے ہی آشیانے پر بجلی گری ہوگی خدا جانے کس پر گری ہوگی اور کہاں گری ہوگی۔ میرا گھر تو غالباً بچ ہی گیا ہوگا۔

یہ ایسا دردناک موقع ہے کہ سننے والوں کا دل اس طایرِ گرفتار کی مصیبت اور خیال پر بھر آتا ہے۔ باقی الفاظ سے تمام مضمون ادا ہو جاتا ہے۔

(۴) بعض موقعوں پر ایسا لفظ اور جملہ چھوڑ گئے ہیں کہ شعر کے سنتے ہی سامع کا ذہن اس طرف منتقل ہو جاتا ہے اور لطف دے جاتا ہے۔

مجھ تک کب ان کی بزم میں آیا تھا دورِ جام   ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

اُن کی محفل میں ہم تک کبھی دورِ جام آیا ہی نہیں آج جو ہم تک پہنچا ہے کہیں ایسا تو نہیں کہ ساقی نے شراب میں کوئی ایسی چیز ڈال دی ہو کہ ہمارا کام ہی تمام ہو جائے۔ اس شعر میں

مصرعۂ ثانی سے پہلے یہ جملہ محذوف ہے (پھر آج جو خلافِ عادت جام کی نوبت مجھ تک پہنچی) یہ ایسا حذف ہے کہ بغیر اظہار کے دونوں مصرعوں میں بول رہا ہے اور شعر کو بلند کر رہا ہے۔ یہ طرز قدیم اساتذہ کا ہے مصحفی و ناسخ اور وزیر کے یہاں اس قسم کے اشعار بہت ہیں میر و مرزا کے یہاں ہیں مگر کم۔

(میر) گل میں ان کی سی جو بو آئی تو آیا نہ گیا
ہم کو بن دوش ہوا باغ سے لایا نہ گیا

اس میں (ناتوانی) کا لفظ محذوف ہے جس کی طرف سامع کا ذہن خود منتقل ہو جاتا ہے۔

(۵) بعض اشعار ذو معنین خوب لکھتے ہیں۔

سر اڑانے کے جو وعدے کو مکرر چاہا
ہنس کے بولے کہ ترے سر کی قسم ہے ہم کو

حالی کہتے ہیں کہ اس شعر میں (ترے سر کی قسم ہے ہم کو) کے دو معنی ہیں۔ ایک یہ کہ تیرے سر کی قسم ہم ضرور تیرا سر اڑائیں گے دوسرے یہ کہ ہم کو تیرے سر کی قسم ہے یعنی کبھی ہم تیرا سر نہ اڑائیں گے۔ یہ طرز بھی قدیم اساتذہ کا ہے اور اس طرز پر ہر ادنیٰ و اعلیٰ شاعر نے طبع آزمائی کی ہے۔

(یاسمین کینزک اقتضا) یاد آیا مجھے گھر دیکھ کے دشت
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

(۶) تہذیب و متانت کے ساتھ شوخی بھی ان کے کلام میں خوب ہے۔

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہور کی

کہاں میخانے کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

(۷) جوشِ بیاں مرزا غالب کے یہاں بہت زیادہ ہے۔

مرتا ہوں اس آواز پہ ہر چند سر اڑ جائے
جلاد کو لیکن وہ کہے جائیں کہ ہاں اور

ہے ہوا میں شراب کی تاثیر
بادہ نوشی ہے بادپیمائی

(۸) ان کے کلام میں حُسنِ الفاظ، حُسنِ بندش، حُسنِ ترکیب بھی خوب ہے۔

دیکھو تو دل فریبیٔ اندازِ نقشِ پا
موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی

چار موج اٹھتی ہے طوفانِ طرب سے ہر سو
موجِ گل موجِ شفق موجِ صبا موجِ شراب

پھر بھر رہا ہوں خامۂ مژگاں بخونِ دل
سازِ چمن طرازیٔ داماں کئے ہوئے

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

(۹) تماثلِ ترکیب کی مثالیں بھی ان کے کلام میں خوب ہیں یعنی تمام فقرے ہموزن ہیں۔

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا
لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

اِدھر وہ بدگمانی ہے اِدھر یہ ناتوانی ہے
نہ پوچھا جائے ہے اُس سے نہ بولا جائے ہے مجھ سے

(۱۰) نالۂ و نوشِ حسرت و یاس، ہائے و ہو کے مضامین خوب ادا کئے ہیں۔ ان کے اس قسم کے اشعار میں وہ سوز و گداز ہے کہ مہمل شعر بھی دل کے پار نکل جاتا ہے خستگی و برشتگی اور درد اور میر کے بعد غالب سے زیادہ کسی کے کلام میں نہیں۔

ہیں بسکہ جوشِ بادہ سے شیشے اچھل رہے
ہر گوشۂ بساط ہے سر شیشہ باز کا

میں اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں
گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا

ہے دورِ قدح وجہِ پریشانیٔ صہبا
یکبار لگا دو خمِ مے میرے لبوں سے

ساقی گری کی شرم کرو آج ورنہ ہم
ہر شب پیا ہی کرتے ہیں مے جس قدر ملے

کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ
ہے یوں کہ مجھے دردِ تہِ جام بہت ہے

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید ناامیدی اُس کی دیکھا چاہیے

کس سے محرومیٔ قسمت کی شکایت کیجیے
ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

نام کا میرے ہے وہ دُکھ ہے کہ کسی کو نہ ملا
کام میں میرے ہے وہ فتنہ ہے کہ برپا نہ ہوا

ہر قدم دوریٔ منزل ہے نمایاں مجھ سے
میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی
لکھ دیجیو یارب اُسے قسمت میں عدو کی

عرضِ نیاز عشق کے قابل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی
دونوں کو اک نظر میں رضامند کر گئی

دُکھتا جہاں ہے غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

دردِ منّت کشِ دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا

(۱۱) بعض محاورات کو نہایت خوبی اور برجستگی سے باندھا ہے۔

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے
صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسد
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

اس کو بھولا نہ چاہیے کہنا
صبح جو جائے اور آئے شام

(۱۲) تمثیلی رنگ میں شعر کہنا مسلم الثبوت ذی العلم قادر الکلام شاعر کا کام ہے۔ ناسخ، نصیر، ذوق نے اس طرز میں بہت زیادہ اظہارِ کمال کیا ہے۔ حالی لکھتے ہیں۔[۵۷]

"استعارہ بلاغت کا رکنِ اعظم ہے اور شاعر کو اس کے ساتھ وہی نسبت

---

۵۷ مقدمہ شعر و شاعری ص ۱۵۲

ہے جو قالب کو روح کے ساتھ کنایہ اور تمثیل کا حال بھی استعارے کے قریب قریب ہے یہ سب چیزیں شعر میں جان ڈالنے والی ہیں ۔

مرزا غالب نے بھی اس طرز پر چند شعر لکھے ہیں اور خوب لکھے ہیں ۔

زنار باندھ سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال
رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

(۱۳) اردو شعر میں عربی فقرات کا تضمین کرنا بہت مشکل ہے ۔ ذوق و مومن نے اس میں بہت کچھ اظہارِ کمال کیا ہے ۔ مرزا غالب کے بھی اس قسم کے دو شعر ہیں ۔

جان مطرب ترانۂ ہل من مزید ہے
لب پردہ سنج زمزمۂ الاماں نہیں

دھوپ کی تابش آگ کی گرمی
وقنا ربنا عذاب النار

(۱۴) ٹھیٹ اردو یعنی ایسی اردو جس میں عربی فارسی کا کوئی لفظ نہ ہو ۔ ہر دور کے اساتذہ کے کلام میں اس قسم کے اشعار ہیں ۔ دورِ پنجم کے اساتذہ کے کلام میں بھی اس قسم کے اشعار کی خاصی تعداد ہے ۔ مرزا غالب کے دیوان میں صرف ایک شعر ہے مگر لاجواب ہے ۔

لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ
جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکہ کھائیں کیا

(۱۵) مروجہ تصوف شاعری کی جان ہے شیخ علی حزیں کا مشہور قول ہے ۔
(تصوف برائے شعر گفتن خوب است) اردو کے ہر شاعر نے مضامینِ تصوف کو بیا ہے ۔ مرزا غالب کے دیوان میں پندرہ بیس اشعار اس قسم کے ہیں مگر بہت اچھے ہیں ۔

ہر چند ہر ایک شے میں تو ہے   پر تجھ سی تو کوئی شے نہیں ہے

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

(۱۶) نیچرل اشعار۔ حالی نے نیچرل اشعار کی یہ تعریف کی ہے کہ شعر میں ایسی باتیں بیان کی جائیں جیسی کہ دنیا میں ہمیشہ ہوا کرتی ہیں یا ہونی چاہئیں۔

ہر دور کے اساتذہ کے دواوین میں اس قسم کے اشعار کثرت سے موجود ہیں۔ مرزا کے دیوان میں بھی کچھ اشعار اس قسم کے ہیں۔

تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا
اڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

(۱۷) شاعری کے اعلیٰ فوائد میں سے یہ ہے کہ وہ ملک و قوم کو کوئی پیام دے۔ موعظت کو پیش کرے۔ بزرگوں کا مشہور مقولہ ہے (شاعری جزویست از پیغمبری) یعنی جس طرح پیغمبر اپنے الہامی وعظ و نصائح سے قوم کو ضلالت سے نکال کر ہدایت پر لاتا ہے اسی طرح شاعر اپنے زورِ کلام سے انسان کو موعظت کی طرف ترغیب کرتا ہے۔

نیاز فتحپوری لکھتے ہیں۔

"اس میں شک نہیں کہ شاعری اخلاق کی درستی کے لئے بہترین شے ہے"[1]

لہ نگار ستمبر ۱۹۳۲ء

مولوی شبلی نعمانی لکھتے ہیں۔

"شریفانہ اخلاق پیدا کرنے کا شاعری سے بہتر کوئی آلہ نہیں ہو سکتا۔"[1]

سید مسعود حسین ادیب ایم اے لکھتے ہیں۔[2]

"شاعری بگڑے ہوئے اخلاق کو سنوارتی ہے اور گری ہوئی قوموں کو ابھارتی ہے۔"

اردو شاعری کے ہر دور کے اساتذہ کے کلام میں اخلاقی اشعار ہیں۔ دورِ پنجم کے اساتذہ میں ناسخ، آتش، ذوق، نصیر وغیرہ نے مضامینِ اخلاق کو صاف بیان و زبان کے ساتھ دل چسپ طریقہ پر عمدہ تمثیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ جو ملک و قوم کے لئے بہت کارآمد اور بہترین پیام ہے۔ مرزا غالب کے دیوان میں دس شعر اس قسم کے ہیں۔ ان میں سے چار تو ایسے ہیں کہ ان کو کوئی شخص دل چسپی سے نہیں پڑھ سکتا۔ اس لئے ان سے اس کے سوا کوئی فائدہ نہیں کہ بھکاری فقیروں کی صدا میں کام آئیں۔ باقی پانچ شعر بہت اچھے ہیں۔

اے چشم دیکھ تو بھی حیا سے جدا نہ ہو
وہ آنکھ ہی نہیں ہے کہ جس میں حیا نہ ہو

گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر
کی جس سے بات اس نے شکایت ضرور کی

(۱۸) اردو شاعری کے اساتذہ نے مناظرِ قدرت کے بھی اشعار لکھے ہیں۔ دورِ پنجم کے اساتذہ میں مناظرِ قدرت کے مضامین کو جس طرح انیس و دبیر نے پیش کیا ہے وہ کسی سے نہیں ہو سکا۔ مرزا غالب نے بھی چند اچھے

---

[1] شعر العجم حصہ چہارم صلا [2] ہماری شاعری صلا

اشعار لکھے ہیں۔

پھر اس انداز سے بہار آئی — کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی
دیکھو اے ساکنانِ خطۂ خاک — اس کو کہتے ہیں عالم آرائی
کہ زمیں ہو گئی ہے سر تا سر — روکشِ سطحِ چرخِ مینائی
سبزہ کو جب کہیں جگہ نہ ملی
بن گیا روئے آب پر کائی

صبح دم دروازۂ خاور کھلا
مہرِ عالمتاب کا منظر کھلا
خسروِ انجم کے آیا صرف میں
شب کو تھا گنجینۂ گوہر کھلا

(۱۹) شعر کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ موسیقی سے موافقت کرے۔ ہر استاد کے کلام میں اس قسم کی غزلیں اور اشعار ہیں۔ مرزا غالب کے کلام کا زیادہ حصہ اسی طرز کا ہے۔

(۲۰) ارباب ذوق و ادب اور اہلِ فن کا اس پر اتفاق ہے کہ مشکل زمینوں میں شگفتہ اشعار کا نکالنا مصحفی کا حصہ تھا اور اس کمال میں اس کا کوئی مدِ مقابل نہیں لیکن مرزا غالب کے دیوان میں بھی دو تین غزلیں ایسی ہیں کہ جن کی زمین نہایت سنگلاخ ہے مرزا نے ایسے شگفتہ اشعار نکالے ہیں جو اپنی آپ ہی نظیر ہیں۔

رہے اس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے
تکلف برطرف تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی
خیالِ مرگ کب تسکین دلِ آزردہ کو بخشے
مرے دامِ تمنا میں ہے اک صیدِ زبوں وہ بھی

مرے دل میں ہے شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں
خدا وہ دن کرے جو اُس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

(۲۱) مرزا غالب کے کلام میں چند خوبیاں بہت زیادہ ہیں۔ ایک تو سوز و گداز، اس کا یہ عالم ہے کہ غالب کا مہمل شعر بھی دل کے پار ہو جاتا ہے۔ اس وصف میں درد اور میر کے بعد غالب کا نمبر ہے۔ دوسرے اچھوتا پن وہ معمولی سی بات کو بھی ایسے عجیب و غریب زاویہ سے پیش کرتے ہیں کہ سُن کر اچنبھا سا ہو جاتا ہے اور جہاں سادگی و سلاست کے ساتھ یہ چیز شامل ہو گئی ہے وہاں ان کا کمال حدِ کمال پر پہنچ گیا ہے۔ تیسرے یہ کہ وہ پامال مضامین کو اکثر جدت و شگفتگی سے ادا کرتے ہیں۔ چوتھے یہ کہ وہ الفاظ حسین اور ترکیب چست لاتے ہیں لیکن اکثر موقعوں پر زبان پر قدرت نہ ہونے کی وجہ سے شعر مہمل یا پیچیدہ ہو گئے ہیں۔

مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس — زلفِ سیاہ رُخ پہ پریشاں کیے ہوئے
جی چاہتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن — بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے
پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا — جاں نذرِ دل فریبیٔ عنواں کیے ہوئے
پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں — سر زیر بارِ منتِ درباں کیے ہوئے

(۲۲) شاعر جذبات کی تصویر کھینچتا ہے۔ یہ تصویر جس قدر مطابق اصل ہو گی اسی قدر شعر میں تاثیر پیدا ہو جائے گی۔ جذبات کی تصویر کھینچنے میں اردو شاعری میں درد اور میر کے بعد غالب کا نمبر ہے۔ وہ لوگ جو صرف اسی پر نظر رکھتے ہیں غالب کے گرویدہ ہیں اور جو لوگ جذبات کو زبان و فن کی قبائے موزوں میں ملبوس دیکھنا چاہتے ہیں وہ کلامِ غالب میں اکثر موقعوں پر کفِ افسوس مل کر رہ جاتے ہیں۔

فلسفیانہ شاعری

فلسفیانہ اشعار بھی تمام اساتذہ کے کلام میں موجود ہیں اور سب نے خوب دادِ کمال دی ہے۔ مرزا غالب کے دیوان میں بھی فلسفیانہ اشعار ہیں اور خوب ہیں۔

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور
جز وہم نہیں ہستیِ اشیاء مرے آگے

عالم غبارِ وحشتِ مجنوں ہے سربسر
کب تک خیالِ طرۂ لیلیٰ کیا کریں

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

ترجمہ کی خوبی

مرزا غالب نے کثرت سے فارسی شعراء کے اشعار و خیالات کا ترجمہ کیا ہے لیکن بعض ترجمے ایسے ہیں کہ اصل سے کسی طرح کم نہیں اور بعض بڑھ گئے ہیں۔

لا اعلم

لذت ز درد بسکہ دلِ زارِ من گرفت ناخن زدم بہ داغ اگر بہ شدن گرفت

غالب

دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ جائیں گے کیا

یہ ترجمہ اصل سے بہت بڑھ گیا ہے۔

مُلّا پیامی

ہیم از وفا مدار بدہ وعدہ کہ من
از ذوق وعدۂ تو بخود دانمی رسم

غالب

ترے وعدے پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

اصل سے بہت بلند ہے۔

فارسی کی عمدہ ترکیبیں

اردو کے تمام اساتذہ نے فارسی کی عمدہ اور نفیس ترکیبوں کا استعمال کیا ہے اور نئی تراکیب بھی ایجاد کی ہیں۔ مرزا غالب نے بھی اچھی اچھی ترکیبیں استعمال کی ہیں اور ایجاد کی ہیں۔

مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں
شایانِ دست و بازوئے قاتل نہیں رہا

ہوں ترے وعدہ نہ کرنے پہ بھی راضی کہ کبھی
گوش منت کشِ گلبانگ تسلی نہ ہوا

نشۂ رنگ سے ہے واشدِگل
مست کب بندِ قبا باندھتے ہیں

واشدِگل: پھول کھلنا۔ پھول نشۂ رنگ سے مست ہیں اور یہی نشہ اُن کی شگفتگی کا سبب ہے۔ کیونکہ مست لوگ قبا کے بند نہیں باندھا کرتے گویا پھولوں کے بندِ قبا نشۂ رنگ کے اثر سے کھلے ہیں۔

تشبیہات و استعارات

مرزا غالب نے عمدہ عمدہ تشبیہات و استعارات بھی ایجاد کیے ہیں جیسے بیخودی کو دریا سے، گرداب کو شعلۂ جوالہ سے تشبیہہ دی ہے۔

دل و دیں نقد لا ساقی سے گر سودا کیا چاہے
کہ اس بازار میں ساغر متاعِ دستِ گرداں ہے

ساغر کو متاعِ دستِ گرداں قرار دینا مرزا کی بہترین ایجاد ہے۔ اردو میں تو آج تک کسی نے باندھا نہیں اور فارسی میں بھی جہاں تک میری معلومات ہے کسی شاعر نے نہیں کہا۔ اس شعر کی شرح پسندیدہ اشعار میں آئے گی۔

ہوائے سیرِ گل آئینۂ بے مہریٔ قاتل
کہ اندازِ بخون غلطیدنِ بسمل پسند آیا

رنگِ گل سے خون اور پھولوں کا ہوا سے ہلنا بسمل کا خون میں لوٹنا قرار دیا ہے۔ نہایت عمدہ تشبیہات ہیں۔

یاد کر وہ دن کہ ہر اک حلقہ تیرے دام کا
انتظارِ صید میں ایک دیدۂ بے خواب تھا

تو اُن دنوں کو یاد کر جب تیرے دام کا ہر حلقہ شکار کے انتظار میں چشمِ بے خواب کی طرح کھلا رہتا تھا یعنی تو ہر وقت اس خیال میں رہتا تھا کہ کس طرح عاشقوں کو اپنے دام میں پھنساؤں۔ حلقۂ دام کو دیدۂ بے خواب (کھلی ہوئی آنکھ) سے تشبیہہ دی ہے بہت خوب تشبیہہ دی ہے۔

مینائے مے ہے سروِ نشاطِ بہار سے
بالِ تدرو جلوۂ موجِ شراب ہے

مینائے مے شراب کی صراحی: تدرو ایک پرند چکورہ کی قسم کا بالِ تدرو میں سے ابر کا استعارہ کیا ہے۔ شراب کی صراحی بہار کی خوشی میں

سہرہ دیہاے بن گئی اور بالِ تدروسے موجِ شراب کا نظارہ پیش ہے۔

متحرک تشبیہات پیدا کی ہیں لیکن بہت کم۔ غالب نے اس قسم کی تشبیہات میں ایسا کمال کیا ہے کہ سب سے بڑھ گئے ہیں۔

سلطنت دست بدست آئی ہے

جامِ مے خاتمِ جمشید نہیں

جامِ مے کی سلطنت رندوں کو جمشید سے دست بدست پہنچی ہے۔ یہ جامِ مے خاتمِ جمشید (انگشتریِ سلطنت) نہیں جو بادشاہ ہی کی ذات سے مخصوص ہو۔

رحم کر ظالم کہ کیا بودِ چراغِ کشتہ ہے

نبضِ بیمارِ وفا دودِ چراغِ کشتہ ہے

اے ظالم بیمارِ عشق پر رحم کر اُس کی ہستی ہی کیا ہے۔ اب اس کی نبض کی حالت بجھے ہوئے چراغ کے دھوئیں کی مانند ہے۔

صنائع

مرزا غالب نے بعض اہم صنعتوں کا بھی استعمال کیا ہے۔ دو چار بطور نمونہ لکھی جاتی ہیں۔

(۱) تین شعر اس صنعت میں ہیں کہ ایک فعل کو جو دو معنوں میں مستعمل ہے وجہ شبہ قرار دیا ہے۔

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس دم

میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آبھی نہ سکوں

ضعف میں طعنۂ اغیار کا شکوہ کیا ہے

بات کچھ سر تو نہیں ہے کہ اٹھا بھی نہ سکوں

زہر ملتا ہی نہیں مجھ کو ستمگر ورنہ
کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں

یہ نہایت اہم صنعت ہے۔ مومن نے اپنے واسوخت میں اس قسم کے کئی بند لکھے ہیں۔ آتش کے دیوان میں اس صنعت میں ایک شعر ہے۔ داغ کے یہاں دو شعر ہیں، امیر مینائی کی پوری ایک غزل ہے۔

(۲) صنعتِ ارصاد — یعنی مصرعۂ اولیٰ میں ایسا لفظ لائیں جس سے معلوم ہو جائے کہ مصرعہ ثانی میں فلاں لفظ آئے گا۔

رات پی زمزم پہ مے اور صبح دم
دھوئے دھبّے جامۂ احرام کے

زمزم کے لفظ نے بتا دیا کہ مصرعہ ثانی میں احرام آئے گا۔ یہ تمام غزل اسی صنعت میں ہے۔

(۳) تجاہلِ عارفانہ کسی نکتہ کی وجہ سے کسی شے معلوم کو غیر معلوم ظاہر کرنا۔

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

شاعر جانتا ہے کہ نیند نہ آنے کا سبب بے چینی فراق ہے مگر تجاہل کر کے بے خوابی کا سبب پوچھتا ہے۔

مخاطب سے اقرار کرانے کے لئے تجاہل کرنا یہ صورت اس صنعت میں نہایت اہم ہے۔

ہاں مہ نو سنیں ہم اس کا نام
جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام

شاعر جانتا ہے کہ ہلال، ممدوح کو جھک کر سلام کر رہا ہے مگر اس سے اقرار کرانا چاہتا ہے۔

(۴) صنعت اعتراض - کلام میں ایک ایسا فقرہ یا جملہ لانا کہ کلام اس کے بغیر بھی تمام ہو سکتا ہو۔ اس کو حشو بھی کہتے ہیں۔ حشو کی تین قسمیں ہیں۔ ایک حشو قبیح کہ کلام اس سے بے لطف ہو جائے دوم حشو ملیح کہ کلام اس سے پُر لطف ہو جائے سوم متوسط کہ نہ چنداں قبیح ہو اور نہ چنداں ملیح ہو۔ غالب کا یہ شعر حشو ملیح کا ہیں ہے۔

جو عقدۂ دشوار کہ کوشش سے نہ وا ہو
تو وا کرے اس عقدے کو سو بھی باشارت

اس شعر میں "سو بھی باشارت" حشو ملیح ہے۔

(۵) صنعت تلمیح - یعنی کلام میں کسی مشہور قصے کی طرف اشارہ کرنا یا کسی مسئلہ کا ذکر کرنا جو کتب متداول میں مذکور ہو۔

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش پر زنانِ مصر سے
ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہو گئیں

اس شعر میں اس قصے کی طرف اشارہ ہے کہ زنانِ مصر نے حضرت یوسف کو دیکھا تو ایسی محو ہوئیں کہ بجائے ترنج کے اپنے ہاتھ کاٹ لئے۔

(۶) رعایتِ لفظی کو بھی انھوں نے چند جگہ نہایت خوبی سے استعمال کیا ہے۔

باغِ شگفتہ تیرا بساطِ نشاطِ دل
ابرِ بہار خم کدہ کس کے دماغ کا

قید میں ہے تیرے وحشی کو وہی زلف کی یاد
ہاں کچھ اک رنجِ گراں باریِ زنجیر بھی تھا

جب کہ میں کرتا ہوں اپنا شکوۂ ضعفِ دماغ
سر کرے ہے وہ حدیثِ زلفِ عنبر بارِ دوست

کی اس نے گرم سینۂ اہلِ ہوس میں جا
آوے نہ کیوں پسند کہ ٹھنڈا مکان ہے

میزانِ عروض

مرزا غالب کا صحیح اور عمدہ کلام میزانِ عروض پر بھی صحیح اترتا ہے۔ بحرِ شگفتہ ہیں مرزا نے اپنے دیوان میں انیس بحروں سے کام لیا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ علمِ عروض پر وسیع نظر رکھتے تھے۔

درد منت کشِ دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا

فاعلاتن مفاعلن فعلن ــــ بحرِ خفیف چھ رکنی

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا   دل جگر تشنۂ فریاد آیا

فاعلاتن فعلاتن فعلن ــــ بحرِ رمل چھ رکنی

گھر جب بنا لیا ترے در پر کہے بغیر
جانے گا اب بھی تو نہ مرا گھر کہے بغیر

مفعول فاع لات مفاعیل فاع لن ــــ بحرِ مضارع آٹھ رکنی

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن ــــ بحرِ ہزج آٹھ رکنی

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

مفتعلن مفاعلن مفتعلن مفاعلن ــــ بحرِ رجز آٹھ رکنی

علمِ مجلسی

شعراء کے کلام میں کچھ اشعار ایسے بھی ہوتے ہیں جو مجالس و محافل اور عام گفتگو میں لطفِ سخن بڑھاتے ہیں یا کسی ثبوت میں پیش کیے جاتے ہیں

ان کو ضرب الامثال کہتے ہیں۔ مرزا غالب کے دیوان میں ایسے اشعار کی خاصی تعداد ہے یہ امران کی استادی کو ثابت کرنے والا ہے۔ میرے خیال میں ان کے دیوان میں اس قسم کے اشعار کم و بیش پچاس ساٹھ ہیں۔

بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل — جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا
کس سے محرومیِ قسمت کی شکایت کیجے — ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا
یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب — تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا
کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ — ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا
رہا گر کوئی رو تا قیامت سلامت — پھر اک روز مرنا ہے حضرت سلامت
میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب — مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے
عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب — دل کا کیا حال کروں خونِ جگر ہونے تک
ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن — خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک
مضمحل ہو گئے قویٰ غالب — وہ عناصر میں اعتدال کہاں
کی وفا ہم سے تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں — ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو بُرا کہتے ہیں
اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو — جو مے و نغمہ کو اندوہ ربا کہتے ہیں
مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس دم — میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں
بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب — تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں
وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے — کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں
اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا — لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں
سیکھے ہیں مہ رخوں کے لیے ہم مصوری — تدبیر کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے
کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی — بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو
ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے — بے نیازی تری عادت ہی سہی
چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد — گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی
بے خودی بے سبب نہیں غالب — کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

عشق نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

سفینہ جب کہ کنارے پہ آ لگا غالب
خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیئے

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میری نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہور کی

جب توقع ہی اٹھ گئی غالب
کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

بیگانگیِ خلق سے بے دل نہ ہو غالب
کوئی نہ ہو تیرا تو مری جان خدا ہے

پسندیدہ اشعار

مرزا غالب کے بعض اشعار کو خصوصیت کے ساتھ اساتذہ و شعراء و مصنفین نے پسند کیا ہے۔ میں نے اس عنوان کے تحت میں اس قسم کے اشعار کو جمع کرنے کی کوشش کی ہے۔ فقیر نے فقط سبحان اللہ لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کر دیا ہے۔

حضرت علامہ مفتی صدر الدین صاحب آزردہ دہلوی ہمعصر غالب نے اس شعر کو بہت پسند فرمایا تھا۔

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا
لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں
سبحان اللہ

آگے شعر کے نیچے پسند کرنے والے کا صرف نام لکھ دیا جائے گا۔

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا
ذوق۔ سبحان اللہ

سادگی و پرکاری بےخودی و ہشیاری
حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا
حسرت۔ طباطبائی۔ بیخود دہلوی

تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا — اڑنے سے پیشتر ہی مرا رنگ زرد تھا

بے خود

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں — وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

طلب طبائی

دکھاؤں گا تماشا دی اگر فرصت زمانے نے — مرا ہر داغِ دل اک تخم ہے سروِ چراغاں کا

آسی

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا — آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

حالی

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں — عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا

بے خود

خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
چراغِ مردہ ہوں میں بے زباں گورِ غریباں کا

آسی

کم نہیں نازشِ ہمنامیِ چشمِ خوباں
تیرا بیمار برا کیا ہے جو اچھا نہ ہوا

آسی

لاگ ہو تو ہم اسے سمجھیں لگاؤ — جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

حالی ۔ سبحان اللہ

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد — مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

حالی لکھتے ہیں اس شعر میں ایک نئی طرح کی شوخی ہے جو بالکل اچھوتی ہے۔ راقم سطور عرض کرتا ہے کہ یہ صحیح ہے مگر لفظ (گنہ) کا آنا صحیح نہیں جمع یعنی (گناہوں) کی ضرورت تھی اس لئے شعر عیب دار ہو گیا۔

کہتے ہیں جیتے ہیں امید پہ لوگ — ہم کو جینے کی بھی امید نہیں

حالی ۔ سبحان اللہ

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام — ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

حالی

ہے مشتمل وجودِ صور پر نمودِ بحر — یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

حالی

نظر لگے نہ کہیں اُن کے دست و بازو کو — یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

آغا محمد باقر نے لکھا ہے یہ شعر مرزا کے لاجواب شعروں میں سے ہے۔ راقم سطور عرض کرتا ہے کہ اس شعر کے صحیح ہونے میں کلام ہے اس پر پہلے لکھا جا چکا ہے۔

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے کاندھوں پر پریشاں ہو گئیں

آغا باقر۔ سبحان اللہ

ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو دین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

طباطبائی

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے — دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

حالی۔ سبحان اللہ

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال — ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

طباطبائی۔ بیخود

نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

آسی

سر اڑانے کے جو وعدے کو مکرر چاہا
ہنس کے بولے کہ ترے سر کی قسم ہے ہم کو

آسی

بچتے نہیں مواخذۂ روزِ حشر سے قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو
آسی (افلاطا میں اس شعر کو دیکھئے)

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں
سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے گراں کیوں ہو
طبا طبائی

کیا غم خوار نے رسوا لگے آگ اس محبت کو
نہ لائے تاب جو غم کی وہ میرا راز داں کیوں ہو
طبا طبائی

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو
طباطبائی ۔ آسی ۔ سبحان اللہ

کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی
بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو
طباطبائی ۔ حسرت ۔ سبحان اللہ

غالب ترا احوال سنا دیں گے ہم ان کو وہ سن کے بلا لیں یہ اجارہ نہیں کرتے
(آقا باقر)

ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا کس سے کہوں کہ داغِ جگر کا نشان ہے
طباطبائی

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی اب کسی بات پر نہیں آتی
طباطبائی ۔ سبحان اللہ

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے
بیخود ۔ سبحان اللہ

قطعہ

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل
زنہار اگر تمھیں ہوسِ نائے و نوش ہے

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے

ساقی بجلوہ دشمنِ ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے

لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے

یا صبح دم جو دیکھیے آ کر تو بزم میں
نے وہ سرور و شور نہ جوش و خروش ہے

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

آغا باقر

سایہ کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر
تو اس قدِ دلکش سے جو گلزار میں آوے

بیخود

دے مجھ کو شکایت کی اجازت کہ ستمگر
کچھ تجھ کو مزا بھی مرے آزار میں آوے

طباطبائی — بیخود

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے

آغا باقر — سبحان اللہ

بے طلب دیں تو مزا اس سے سوا ملتا ہے
وہ گدا جس میں نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے

بیخود

نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی
امتحاں اور بھی باقی ہو تو یہ بھی نہ سہی

طباطبائی۔ آسی۔ سبحان اللہ

رہا آباد عالم اہلِ ہمت کے نہ ہونے سے
بھرے ہیں جس قدر جام و سبو میخانہ خالی ہے

حالی

کیا بیاں کر کے مرا روئیں گے یار
مگر آشفتہ بیانی میری

آغا باقر

نقشِ نازِ بتِ طناز بہ آغوشِ رقیب   پائے طاؤس پئے خامۂ مانی مانگے

آسی ۔ آغا باقر (گھپلک ہے)

اُدھر یہ بدگمانی ہے اِدھر یہ ناتوانی ہے   نہ پوچھا جائے ہے اس سے نہ بولا جائے ہے مجھ سے

طباطبائی ۔ سبحان اللہ

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر   کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

آسی ۔ سبحان اللہ

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے

رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

طباطبائی ۔ سبحان اللہ

روتے سے اور عشق میں بے باک ہو گئے   دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہو گئے

حالی ۔ سبحان اللہ

ہیچ آپڑی ہے وعدۂ دیدار کی مجھے   وہ آئے یا نہ آئے یہ یاں انتظار ہے

بیخود

اک خونچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں   پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

طباطبائی

کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ   ہے یوں کہ مجھے دردِ تہِ جام بہت ہے

آسی

ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں   پابستگیٔ رسم و رہِ عام بہت ہے

طباطبائی

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی

اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

آغا باقر

محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا — اُسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

بیخود

دل و دیں نقد لا ساقی سے گر سودا کیا چاہے

کہ اس بازار میں ساغر متاعِ دستِ گرداں ہے

طبا طبائی سبحان اللہ

رہے اُس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے

تکلف برطرف تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی

نیاز فتحپوری سبحان اللہ

قہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو — کاش کہ تم مرے لیے ہوتے

نیاز

تو اور سوئے غیر نظرہائے تیز تیز — میں اور دُکھ تری مژہ ہائے دراز کا

نیاز سبحان اللہ

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد — یا رب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

طبا طبائی سبحان اللہ

قسمت بری سہی پہ طبیعت بری نہیں — ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے

طبا طبائی

مرزا غالب کے مخالف مرزا یگانہ چنگیزی مصنف غالب شکن نے اشعار مرقومہ ذیل کو پسند کیا ہے۔

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا — جامِ جم سے یہ مرا جامِ سفال اچھا ہے

بہت دنوں میں تغافل نے ترے پیدا کی — وہ اک نگہ جو بظاہر نگاہ سے کم ہے

سبحان اللہ

خوش ہوتے ہیں پر وصل میں یوں مر نہیں جاتے — آئی شب ہجراں کی تمنا مرے آگے

سبحان اللہ

اسدؔ بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے تو مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر

سبحان اللہ

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

قصاید

سونپے ہے فیضِ ہوا صورتِ مژگانِ یتیم سرنوشتِ دو جہاں ابر بیک سطرِ غبار

موجِ گل ڈھونڈھ بہ خلوت کدۂ غنچۂ باغ گم کرے گوشۂ میخانہ میں گر تو دستار

سُن کے طاؤس کرے آئینۂ خانہ پرواز ذوق میں جلوہ کے تیرے بہ ہوائے دیدار

آغا باقر

اس کو بھولا نہ چاہیئے کہنا صبح جو جائے اور آئے شام

آغا باقر سبحان اللہ

مے بھی پرسے نہ کیوں پیئے جاؤں غم سے جب ہوگئی ہو زیست حرام

آغا باقر

تین دن مسہل سے پہلے تین دن مسہل کے بعد تین مسہل تین تبریدیں یہ کل کے دن ہوئے

مرزا غالب کے اور بھی اشعار ہیں جن کو صاحبانِ علم وفن پسند کرتے ہیں۔ راقم سطور نے ایک مجموعہ طیار کیا ہے اس میں مرزا کا صرف وہ کلام معہ تشریح ہے جو اغلاط و معائب سے پاک ہے اور جس میں تغزل کا رنگ بھی خوب ہے اور استعارات و تشبیہات نفیس ہیں میں نے اس کا نام کمالِ غالب رکھا ہے اس کتاب کے بعد غالباً اس کو طبع کرا سکوں گا۔

بدیہہ گوئی

کسی خاص موقع پر یا کسی فرمائش پر فوراً کوئی شعر یا نظم لکھ دینا یہ ایک خاص کمال ہے۔ مرزا غالب سے کلکتہ میں مولوی کرم حسین نے ایک مجلس میں اپنے ہاتھ پر چکنی ڈلی رکھ کر

مرزا سے فرمائش کی کہ اس کی تشبیہات نظم کیجیے مرزا نے وہیں بیٹھے بیٹھے یہ قطعہ لکھ دیا۔

ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی ‏ ‏ زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہیے
خامہ انگشت بدنداں ہے اسے کیا لکھیے ‏ ‏ ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے
اخترِ سوختۂ قیس سے نسبت دیجے ‏ ‏ خالِ مشکینِ رخِ دل کشِ لیلیٰ کہیے
حجر الاسود دیوارِ حرم کیجیے فرض ‏ ‏ نافہ آہوئے بیابانِ ختن کا کہیے
صومعہ میں اسے ٹھہرائیے گر مہرِ نماز ‏ ‏ میکدے میں اسے خشتِ خمِ صہبا کہیے
مسی آلودہ سرِ انگشتِ حسیناں لکھیے ‏ ‏ داغ طرفِ جگرِ عاشقِ شیدا کہیے
مہرِ مکتوبِ عزیزانِ گرامی لکھیے ‏ ‏ حرزِ بازوئے شگرفانِ خود آرا کہیے
خاتمِ دستِ سلیماں کے مشابہ لکھیے ‏ ‏ سرِ پستانِ پری زاد سے مانا کہیے
وضع میں اس کو سمجھ لیجیے قافِ تریاق ‏ ‏ رنگِ سبزۂ نوخیز مسیحا کہیے
کیوں اسے قفلِ درِ گنجِ محبت لکھیے ‏ ‏ کیوں اسے نقطۂ پرکارِ تمنا کہیے
کیوں اسے گوہرِ نایاب تصور کیجیے ‏ ‏ کیوں اسے مردمکِ دیدۂ عنقا کہیے
کیوں اسے تکمۂ پیراہنِ لیلیٰ لکھیے ‏ ‏ کیوں اسے نقشِ پئے ناقۂ سلمیٰ کہیے
بندہ پرور کے کفِ دست کو دل کیجیے فرض ‏ ‏ اور اس چکنی سپاری کو سویدا کہیے

اگرچہ اس نظم میں اسقام ہیں جیسے (وضع میں اس کو سمجھ لیجیے قافِ تریاق) محاورہ ہے کسی استاد نے اس طرح نہیں باندھا۔ طباطبائی نے بھی یہ اعتراض کیا ہے اور مصرعہ (خالِ مشکینِ رخِ دل کشِ لیلیٰ کہیے) اور مصرعہ (داغِ طرفِ جگرِ عاشقِ شیدا کہیے) میں تکرارِ اضافت کا عیب ہے لیکن میرے خیال میں فی البدیہہ نظموں میں اس قدر تشدد نہیں کرنا چاہیے جو کچھ ہے خوب ہی خوب ہے۔

معاصرانہ چشمک

مرزا غالب پر ان کے معاصرین میں سے جب کسی نے کوئی چوٹ کی تو مرزا نے نہایت متانت سے جواب دیا۔

حکیم آغا خاں عیش دہلی کے مشہور شعرا اور اساتذہ میں سے تھے۔ مرزا غالب کے پیچیدہ کلام پر فرمایا۔

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے
مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے
کلام میر سمجھے اور زبانِ میرزا سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

غالب نے اس کے جواب میں لکھا۔

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل
سن سن کے اسے سخنورانِ کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمایش
گویم مشکل وگر نہ گویم مشکل

جب لوگوں نے بہت کچھ بار بار اعتراضات کیئے تو مرزا نے کہا۔

نہ ستایش کی تمنا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

ایک مرتبہ مرزا نے کئی مشاعروں میں غزل نہ پڑھی ذوق نے چوٹ کی۔

رکا وٹ خوب نہیں طبع کی روانی میں
کہ بو فساد کی آتی ہے بند پانی میں

اس کے جواب میں مرزا نے کہا

پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

جب مرزا کا دیوان طبع ہو کر آیا تو دہلی کے ایک شاعر عبداللہ خاں انیج نے کہا۔

ڈیڑھ جزو پر بھی تو ہے مطلع و مقطع غایب
غالب آسان نہیں صاحب دیوان ہونا

مرزا نے اس کو ہنس کر ٹال دیا۔

ظفر بادشاہ کے بیٹے شہزادہ جواں بخت کا مرزا نے سہرا لکھا۔ اس کا مقطع تھا۔

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں
دیکھیں اس سہرے سے کہدے کوئی بڑھ کر سہرا

بادشاہ سمجھے کہ یہ ہمارے استاد ذوق پر چوٹ ہے۔ بادشاہ نے ذوق سے سہرے

کی فرمائش کی اور کہا کہ مقطع پر نظر رکھیں ذوق نے سہرا لکھا اور اس میں یہ شعر لائے۔

جس کو دعویٰ ہو سنا دے کوئی جا کر اس کو
دیکھ اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

غالب نے اس پر معذرت میں ایک قطعہ لکھا اس کے بعض اشعار میں در پردہ ذوق پر چوٹیں ہیں۔

مرزا کا سلسلۂ نسب حکمران خاندان سے تھا۔ ذوق غریب اور معمولی خاندان کے فرد تھے ان کی عزت و شہرت کا ذریعہ صرف شاعری تھی اس پر چوٹ ہے۔

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری — کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

مرزا غالب سرخ سفید رنگ کے آدمی تھے ذوق کا سانولا رنگ تھا اس پر اشارہ ہے۔

روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ — سودا نہیں جنوں نہیں وحشت نہیں مجھے

لیکن افسوس ہوتا ہے کہ مرزا صاحب نے بعض معاصرین پر بیجا نکتہ چینی اور حملے بھی کئے ہیں۔ مولوی عبدالسلام ندوی لکھتے ہیں۔

"مرزا[۵] غالب نے بھی ایک موقع پر دلی اور لکھنؤ کی شاعری کے متعلق یہ رائے ظاہر کی تھی کہ دلی کا مضمون اور لکھنؤ کی زبان مستند ہے اور اس کے ثبوت میں بحر کا یہ مصرعہ پڑھ کر (نہا تا ہے وہ مہ دریا میں کپڑے حور دھوتی ہے) کہا کہ یہ معشوق کی تعریف نہیں ہوئی بلکہ ایسا غریب معشوق ہے کہ کھرّے گھاٹ کپڑے دھلواتا ہے۔"

مرزا صاحب نے یہ خیال نہیں فرمایا کہ اس سے معشوق کی جلالت شان ثابت ہوتی ہے کہ معشوق ایسا مقتدر ہے کہ حور سے کپڑے دھلواتا ہے اس سے غربت ثابت نہیں ہوتی ایسے موقعے بھی ہو جاتے ہیں کہ بعض امرا کو بھی کھرّے گھاٹ کپڑے دھلوانے پڑتے ہیں اس کے علاوہ معشوق کی صفت میں صاحب مال ہونا داخل نہیں۔ اہلِ نظر حسنِ صورت

۵؎ شعر الہند حصہ اول ص ۲۱۵ بحوالہ جلوۂ خضر جلد اول ص ۲۳۷

یا حسین سیرت پر عاشق ہوتے ہیں۔ صاحبانِ زر کا منہ دریوزہ گر تکتے ہیں۔ اگر یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ مرزا کا یہ اعتراض کسی طرح صحیح ہے تو اس قسم کے اعتراض سے بہت کم اساتذہ بچ سکتے ہیں۔ مرزا غالب کا معشوق بحر کے معشوق سے بھی زیادہ مفلس ہے اس کو پہننے کے لئے جوتا بھی میسر نہیں ننگے پیر پھرتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

دیکھو تو دل فریبیِ اندازِ نقشِ پا ۔۔۔ موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی

ایک خط میں اُردوے معلی میں لکھتے ہیں دکہ واے بران آنچ دلپوچ کہ صہبائی کی شاگردی پہ فخر کرتا ہے، گویا صہبائی مرزا کے نزدیک کوئی شاعر اور استاد نہ تھے۔ مولانا امام بخش صہبائی فارسی شاعری کے مسلم الثبوت اساتذہ میں سے تھے۔ مرزا صاحب کو یاد نہیں رہا وہ خود صہبائی کی استادی کو تسلیم کر چکے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

ہند را خوش نفسانند سخنور کہ بود ۔۔۔ باد در خلوتِ شان مشک فشاں از دمِ شان

مومن و نیر و صہبائی و علوی وانگاہ ۔۔۔ حسرتی اشرف و آزردہ بود اعظم شان

مرزا غالب کے متعلق رائیں

تقریباً ایک ربع کلام یعنی کم و بیش پانچسو شعر مرزا غالب کے ایسے ہیں جن کو صحیح اردو شاعری کہا جا سکتا ہے وہ کلام حقیقت میں بہت خوب اور عمدہ ہے اس کو سب نے پسند کیا ہے۔

شمس العلماء پروفیسر آزاد لکھتے ہیں۔

"بعض شعر صاف بھی نکل جاتا ہے تو قیامت ہی کر جاتا ہے"[1]

شمس العلماء نواب امداد امام اثر لکھتے ہیں۔

"ان معائب سے گزر کر اس یکتائے روزگار کے کلام کو انصاف کی نگاہ سے دیکھو تو پھر حسن کی کوئی انتہا بھی نظر نہیں آتی واقعی جو سوز و گداز[2]

---

[1] آب حیات ذکرِ غالب [2] کاشف الحقائق جلد دوم

خستگی، دردبرشتگی، شعریت، بلند پروازی، نازک خیالی، متانت، حلاوت، تہذیب، شوخی غالب کے کلام میں ہے۔ باستثنائے درد و میر کے کسی استاد کے کلام میں نہیں۔ شعریت تو ایسے غضب کی ہے کہ میر صاحب کے کلام میں بھی اس سے زیادہ نہ ہوگی پر تاثیری کا کیا کہنا دل بے اختیار چلا اٹھتا ہے کہ غزل سرائی اسے کہتے ہیں شوخی کا وہ عالم ہے کہ طبیعت بے چین ہو جاتی ہے۔ عالی مذاقی روح کو عالم بالا کی سیر دکھاتی ہے۔ واردات قلبیہ کے مضامین کی خوبی جذباتی معاملات کے تماشے پیش نظر کر دیتی ہے۔"

افسوس یہ ہے کہ نواب صاحب نے ان کی کچھ تشریح نہ کی کہ جو معائب ہیں وہ کس درجہ کے ہیں اور کس حد تک زبان و فن کے لئے مضرت رساں ہیں اور قانون مملکت ادب میں قابل معافی ہیں یا نہیں اور اس کے بعد جو لاجواب حسن رہتا ہے وہ کس گروہ کے لئے زیادہ مفید ہے میرے خیال میں اس کا یہی جواب ہو سکتا ہے کہ معائب شدید ہیں، ناقابل درگزر ہیں۔ زبان و فن کے لئے سخت مضر ہیں۔ باقی حسن زیادہ تر رقاصوں اور ارباب نشاط کے لئے مفید ہے۔

مرزا یگانہ لکھتے ہیں۔

"وہی آخر عمر کا کلام جو میر کی تقلید ہیں اور اپنی واردات قلبی کے تحت کہا گیا ہے۔ غالب کی جان ہے اور اردو لٹریچر کا سرمایۂ ناز ہے اس پر اردو جتنا بھی چاہے فخر کرے۔"[1]

یگانہ صاحب کو اس قدر اور لکھنا چاہئے تھا کہ جس طرح دوسرے استادوں کا عمدہ کلام ان کے اور زبان و فن کے لئے سرمایۂ ناز ہے اسی طرح مرزا غالب کا قلیل التعداد صحیح کلام بھی ان کے اور اردو کے لئے باعث فخر ہے۔ مولانا حسرت موہانی لکھتے ہیں۔[2]

"زبان کے معاملہ میں غالب کے دہلی کے ہمعصر دلی میں سے استاد ذوق سب سے

---

[1] غالب شکن صہ ۳۱ مطبوعہ ۱۹۳۵ء [2] شرح دیوان غالب صہ ۱

زیادہ محتاط ہیں اور اسی لحاظ سے ہمارے نزدیک اگرچہ بحیثیتِ مجموعی غالب، ذوق و مومن سے افضل ہیں لیکن صرف اردو شاعری کے لحاظ سے ذوق کا غالب سے اور غالب کا مومن سے مرتبہ بلند ہے۔"

"بحیثیتِ مجموعی" سے مولانا کی مراد یہی ہو سکتی ہے کہ غالب اردو کے بھی شاعر ہیں، فارسی کے بھی شاعر ہیں دونوں زبانوں کے نثار بھی ہیں متعدد تصانیف کے مالک بھی ہیں ذوق و مومن میں یہ بات نہیں۔

مولوی عبدالسلام ندوی لکھتے ہیں۔

"غالب[1] کے کلام میں اس قسم کی تشبیہات کا ایک چمن زار نظر آتا ہے۔ اُن کی بعض تشبیہات میں میر کی پر عظمت سادگی بھی پائی جاتی ہے۔ ہر قسم کے مضامین کو اس جوش کے ساتھ ادا کرتے ہیں کہ اُن کی آوازِ بازگشت سے دنیا گونج اُٹھتی ہے۔ غالب نے دردو غم، حسرت و تمنا اور یاس و ناکامی کے مضامین میں انھیں (میر) کا تتبع کیا ہے۔ حُسنِ معنی کے ساتھ غالب کا کلام حسنِ الفاظ، حُسنِ بندش اور حُسنِ ترکیب کا بھی بہترین نمونہ ہے اور ایک مضمون آفریں اور معنی بند شاعر ہیں۔ چستیِ بندش اور حسنِ ترکیب کی جس قدر بہترین مثالیں غالب کے مختصر دیوان میں ملتی ہیں ان کی نظیر سے اردو شعراء کے بڑے بڑے دواوین خالی ہیں۔"

پروفیسر حامد حسن قادری لکھتے ہیں۔

"مومن[2] کے کلام میں عاشقانہ جوش ولولہ اور رنگین بیانی غالب سے

---

[1] شعر الہند حصہ اول ص۲۵۷ تا ص۲۶۳ [2] تاریخ و تنقید ادبیات اردو ص۱۳۳ آگرہ برقی پریس ۱۹۳۹ء

سے بہت زیادہ ہے۔ غالب کے ہاں رفعتِ تخیل، ندرتِ مضمون، حُسنِ معنی اور رعنائیِ ادا اتنی اعلیٰ ہے کہ کوئی شاعر ولی دکنی سے دورِ موجود تک اس حد تک نہیں پہنچا۔"

نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ شاگرد مومن سے مرزا غالب کے خاص تعلقات تھے۔ غالب نے خود اپنی ایک فارسی غزل میں ان تعلقات پر روشنی ڈالی ہے۔

غالب بہ فنِ گفتگو نازد بدیں ارزش کہ او
ننوشت در دیوان غزل تا مصطفےٰ خاں خوش نکرد

نواب صاحب نے ایک تذکرہ لکھا ہے جس کا نام گلشنِ بے خار ہے اس تذکرہ کی خلاف بیانی کی پروفیسر آزاد نے بھی آبِ حیات[۵۱] میں شکایت کی ہے۔ اور نواب صاحب کے ہمعصر سید قطب الدین[۵۲] باطن دہلوی نے بھی لکھا ہے کہ نواب صاحب نے اساتذہ کے ساتھ انصاف نہیں کیا اور انھوں نے صرف سات استادوں کی بربنائے تعلقات بپاطر فداری سے تعریف کی ہے۔ ان میں ایک مرزا غالب بھی ہیں۔ مرزا غالب کے اس مداحِ خاص نے مرزا کے متعلق جو رائے لکھی ہے اس پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بربنائے تعلقات وہ کچھ مدح سرائی پر مجبور رہے ہیں باقی مرزا کے متعلق ان کا وہی خیال ہے کہ کثرت سے ان کا کلام دشوار یا مہمل ہے۔ تراش خراش کے بعد کچھ کلام ان کا ایسا جمع ہوا جس کو صحیح اور قابلِ فہم قرار دیا جاتا ہے۔ لکھتے ہیں۔[۵۳]

"شاہینِ فکرش جز بشکار عنقا نہ پرداز دوا شہبِ طبیعتش جز بعرصۂ فلک نتازد۔ در اوائلِ حال بہ تقاضائے طبع وشوار پسند بطرزِ مرزا عبد القادر بیدل سخن می گفت و دقت آفرینیہا می کرد آخر الامر ازاں طریقہ اعراض کردہ انداز ے ابداع نمودہ دیوانش را بعد ترتیب و تکمیل دیگر نگریست

---

۵۱ آبحیات تذکرہ اشعار ۵۲ گلستانِ بے خزاں صفحہ ۵۳ گلشن بے خار ذکر غالب

فراداں ابیات ازاں حذف و ساقط کردہ تنہا ہے قلیلے انتخاب زدہ"

نواب صاحب نے ذوق، مومن، ناسخ کے متعلق جو رائے ظاہر کی ہے ان پر نظر کر کے اگر اس رائے سے مقابلہ کیا جائے تو معاملہ صاف ہو جاتا ہے۔

ایک مصنف نے کسی شخص کی ذاتی بیاض سے انیس کی رائے شعرائے دہلی کے متعلق حسب ذیل نقل کی ہے۔

"ذوق درباری شاعر ہیں، مومن اپنی طبیعت کے بادشاہ ہیں، غالب یگانۂ روزگار ہیں۔"

اس رائے سے معلوم ہوتا ہے کہ انیس کے نزدیک ذوق اپنے معاصرین میں سے کم درجہ کے شاعر تھے لیکن پروفیسر آزاد نے آب حیات میں ذوق کے متعلق جو انیس کی رائے لکھی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انیس کے نزدیک خواجہ میر درد کے بعد پھر ایسا بلند پایہ کوئی شاعر پیدا ہوا ہی نہیں۔ اب کس کا اعتبار کیجئے۔

اردو نثر

اردو نثر میں ہمیشہ فارسی کی تقلید ہوتی رہی ہے۔ فارسی نثر جس طرح مقفیٰ مسجع ہوتی تھی ویسی ہی اردو ہوتی تھی۔ سادہ اردو لکھنے پر سب سے پہلے شاہ ولی اللہ صاحب نے توجہ دلائی۔ انھوں نے اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں لکھا ہے۔

"جو شخص ذوقِ سلیم[۱] رکھتا ہے وہ یقیناً اپنی تحریر میں سادہ و سلیس جملے استعمال کرے گا اس کی تراکیب نہایت آسان اور سہل ہوں گی اور اسلوب بیان حد درجہ دلکش اور جاذب توجہ ہوگا ایسا شخص ادب کا معیار سمجھا جائے گا۔"

سادہ اردو نثر لکھنے کی بنیاد ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں پڑی، میر امن پہلا

---

[۱] جلد اوّل

شخص ہے جس نے سادہ عبارت لکھی۔

میرامن کی سادہ نثر کا نمونہ

"پہلے اپنا حال یہ عاصی میرامن دلی والا بیان کرتا ہے کہ میرے بزرگ ہمایوں بادشاہ کے عہد سے ہر ایک بادشاہ کی رکاب میں پشت بہ پشت جاں فشانی بجالاتے رہے اور وہ بھی پرورش کی نظر سے قدر دانی جتنی چاہیئے فرماتے رہے۔

علماء، شرفاء، رؤساء، مصنفین، فارسی میں خط وکتابت کرتے تھے۔ رجب علی بیگ سرور لکھنوی نے اردو میں سادہ خطوط لکھنے شروع کیے۔ ایک رقعہ میں لکھتے ہیں۔

"بنارس پہنچا راجہ صاحب سے ملاقات ہوئی دفعتاً عجب واردات ہوئی کہ خبر ویرانیِ لکھنؤ کو بکوہ مشہور ہوئی۔"

ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں۔

"بائیں آنکھ کے نور نے بھی منہ پھیر لیا ہے۔ حواسی نے گھیر لیا جو مرضیِ خدا"

ایک اور رقعہ میں لکھتے ہیں۔

"کلکتہ میں ایک بڑا ڈاکٹر تھا اس سے زیادہ کوئی نہ تھا۔ اس بدبخت نے فریب کیا ایک عرق دے دیا اسے آنکھ میں ڈالتا تھا کہ دوپہر کے بعد دہنی میں بھی غبار شروع ہو گیا اس کو ترقی ہوتی جاتی ہے میرا دم گھبراتا ہے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔"

سرور نے مختصر القاب و آداب کے خطوط بھی لکھے ہیں اور بغیر القاب و آداب کے بھی لکھے ہیں۔

"جناب والا بندگی عرض کرتا ہوں۔"

نصیر الدین حیدر بادشاہ لکھنؤ کو ۱۲۴۴ھ / ۱۸۲۸ء میں ایک درخواست لکھی۔

"حضرت ظل سبحانی خلیفۃ الرحمانی خلد اللہ ملکہٗ و سلطنتہ عرصہ ہوا خانہ زاد نے نسخۂ فسانۂ عجائب پیش کش کیا تھا گو ہدیۂ

مور ناتواں پیشِ سلیمان زماں اور نذر گدا آگے سلطانِ جہان
کے حقیقت نہیں رکھتی۔"

سرور کے بعد غلام غوث خاں بے خبر[1] نے ۱۸۴۶ء سے اُردو میں سادہ خطوط لکھنے شروع کیے۔ احسن[2] مارہروی نے لکھا ہے کہ اردو میں خطوط نویسی کی ابتدا مرزا غالب نے کی حالی[3] نے لکھا ہے کہ ۱۸۵۰ء تک ہمیشہ فارسی میں خط و کتابت کرتے تھے۔ عرشی[4] صاحب نے بھی یہی رائے ظاہر کی ہے۔ پروفیسر حامد حسن[5] نے لکھا ہے کہ غالب کا کوئی خط ۱۸۵۰ء سے پہلے کا نہیں ان بیانات میں کوئی بیان بھی صحیح نہیں دراصل مرزا غالب نے ۱۸۴۹ء سے اردو میں خط لکھنے شروع کیے۔ ان کا ایک خط اردو میں ہرگوپال تفتہ[6] کے نام اگست ۱۸۴۸ء کا ہے۔ سنا ہے کہ کسی شخص نے مرزا کے خطوط کا مجموعہ شائع کیا ہے۔ اس میں ایک خط ۱۸۴۲ء کا برآمد کر کے شامل کیا ہے۔ دیکھیے یہ سلسلہ کب تک چلتا ہے۔ مہر صاحب نے بڑا احسان کیا کہ مرزا غالب کی سات برس کی عمر کی ایک نظم شائع کر کے شاعری کے معجزات کا سلسلہ بند کر دیا۔ کاش کوئی اہلِ قلم اتنی تکلیف گوارا کریں کہ کہیں سے مرزا صاحب کا کوئی سادہ خط ایامِ شیر خوارگی کا برآمد کر کے شائع کر دیں تاکہ آئندہ عجائب نویسی کا سلسلہ بند ہو جائے۔ غرض یہ کہ سادہ نثر اردو اور سادہ اردو خطوط کی ابتدا مرزا غالب نے نہیں کی مرزا کو اس میں شرفِ اولیت حاصل نہیں ہاں مرزا نے اس طرز کو بہت زیادہ رونق و ترقی دی اور ایسے خطوط لکھے کہ جو بے مثل و بے نظیر ہیں۔ مرزا غالب کے شاگرد امراؤ سنگھ کی دو بیاں یکے بعد دیگرے مریں اور صغیر سن اولاد چھوڑی ایک دوسرے شاگرد نے مرزا کو یہ حال لکھا اور یہ بھی لکھا کہ اب وہ تیسری شادی کی فکر میں ہے کیونکہ اولاد

---

[1] داستانِ تاریخ اردو ص ۲۵۵ [2] تاریخ نثر اردو ص ۵۳ [3] یادگار غالب ص ۱۵۶
[4] مکاتیب غالب ص ۱۴، ۱۱، ۱۲ [5] دیباچہ انشائے بے خبر [6] خطوط غالب نسخہ مہیش داس

سال بچوں کا پالنا دشوار ہے مرزا صاحب نے جواب میں لکھا۔

"امراؤ سنگھ کے حال پر اس کے واسطے رحم اور اپنے واسطے رشک آتا ہے اللہ اللہ ایک وہ ہیں کہ دو بارہ ان کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں اور ایک ہم ہیں کہ ایک اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے تو نہ پھندا ہی ٹوٹتا ہے نہ دم ہی نکلتا ہے اس کو سمجھاؤ کہ بھائی تیرے بچوں کو میں پال لوں گا تو کیوں بلا میں پھنستا ہے۔"

منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں۔

"بس اب تم سکندر آباد میں رہے کہیں اور کیوں جاؤ گے بنک گھر کا روپیہ کھا چکے ہو اب کہاں سے کھاؤ گے۔ میاں نہ میرے سمجھانے کو دخل ہے نہ سمجھنے کی جگہ ہے ایک خرخرح ہے کہ وہ چلا جاتا ہے جو ہونا ہے وہ ہوا جاتا ہے اختیار ہو تو کچھ کیا جائے کہنے کی بات ہو کہا جائے رغبتِ جاہ چہ و نفرتِ اسباب کہ۔ م زین ہوس ہا بگزر رہا نہ گزرد مجھ کو دیکھو نہ آزاد ہوں نہ مقید نہ رنجور ہوں نہ تندرست نہ خوش ہوں نہ ناخوش نہ مردہ ہوں نہ زندہ جیے جاتا ہوں باتیں کیے جاتا ہوں روٹی روز کھاتا ہوں شراب گاہ گاہ پیے جاتا ہوں جب موت آئے گی مر ہی رہوں گا نہ شکر ہے نہ شکایت ہے جو تقریر ہے بہ سبیل حکایت ہے۔"

غرض مرزا کے خطوط ہر طرح لاجواب ہیں اور اس سلسلہ میں نہ اردو زبان کے خاص محسنین میں سے ہیں مگر ان کی اردو نثر پر بھی اعتراضات ہیں اور درحقیقت انھوں نے بعض اغلاط کی ہیں جیسے قلم و الماس کو مونث لکھا ہے بیداد کو مذکر لکھا ہے۔ بعض محاورات میں بھی غلطی کی ہے جیسے لکھا ہے (اس قدر عذر چاہتے ہو) صحیح محاورہ (عذر کرنا ۔۔ یا معذرت کرنی) ہے اور لکھا ہے (ہم کو یاد نہ لانا) صحیح محاورہ (یاد کرنا) ہے لیکن میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اغلاط سے کسی کا کلام خالی نہیں۔ محاسنِ کثیر کے

مقابلہ میں معائبِ قلیل کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

اس زمانے میں چوں کہ فارسی ہی کا رواج تھا اور اہلِ علم فارسی رنگین مسجع مقفیٰ لکھتے تھے اردو بھی ایسی ہی شروع ہوئی تھی میر امن اور بے خبر وغیرہ کی عبارتوں نے سادہ اردو نویسی کی صرف بنیاد قائم کی لیکن اس کو فروغ مرزا کی بدولت ہوا۔ لوگوں نے مرزا کی سادہ نگاری کو کم علمی پر محمول کیا اور عدم استعداد اور اہلیت کا نتیجہ سمجھا مگر مرزا کی دور بیں آنکھیں دیکھ رہی تھیں کہ آگے کیسا وقت آرہا ہے اس لئے اس اردو نثر کے مصلح اور محسن نے کسی طنز و طعن کی پروا نہ کی۔

غالباً مرزا غالب کی مداحی کا یہ اثر ہے کہ اردو نثر میں ان کے بعض مداحوں کو بھی روزمرہ اور محاورات کی صحت کا خیال نہیں رہا شیخ محمد اکرام آئی سی ایس لکھتے ہیں۔

"اس وقت نواب احمد بخش نے ایک دفعہ پھر اپنے اثر اور رسوخ اور حکمتِ عملی کا وار چلایا۔"

وار چلانا نہیں بولتے وار کرنا بولتے ہیں اور اس موقع پر وار کا لفظ کسی طرح بھی صحیح نہیں۔ داؤں ہونا چاہئے تھا۔ آگے صـ۳۴ پر لکھتے ہیں۔

"شاہ عالم جنھیں غلام قادر روہیلے نے نورِ دیدہ سے محروم کر دیا تھا۔"

اس فقرہ کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ شاہ عالم کے بیٹے کو قتل کر دیا دوسرے یہ کہ آنکھوں میں کوئی ایسی چیز ڈال دی کہ وہ اندھا ہوگیا۔ حالاں کہ نہ یہ امر واقعہ ہے نہ صاحبِ عبارت کا مفہوم ہے۔ اصل مطلب تو یہ ہے کہ اس نے بادشاہ کی آنکھیں نکلوا دی تھیں جس کا اظہار بادشاہ نے

---

[1] رسالہ شہور دہلی ۱۹۴۲ء [2] آثارِ غالب جزو اول صـ۲ چوتھا ایڈیشن تاج آفس بمبئی۔

خود اپنی ایک نظم میں کہا ہے۔

چشم من کور شد از جورِ فلک بہتر شد
کہ نہ بینم کہ کند غیر جہان داریِ ما

پروفیسر آغا محمد باقر نبیرۂ آزاد دہلوی آزاد کے عالم جنوں کے حالات میں لکھتے ہیں۔

"اس وقت[1] کے کلام کو اکثر یہ کہہ کر دریا برد کر دیا کرتے تھے کہ جا استاد کے پاس"

دریا برد تو اس چیز کو کہتے ہیں جسے دریا خود بہا کر لے جائے۔ اور جو چیز دریا میں ڈالی جائے اسے کہتے ہیں کہ دریا میں بہادی، دریا میں ڈال دی، دریا میں پھینک دی"

---

[1] تاریخ نظم و نثر اردو ص ۲۷۷ بار سوم ۱۹۳۲ء مطبوعہ عالمگیر پریس لاہور

باب چہارم

نتیجہ

خلاصۂ معائبِ کلام غالب

مرزا غالب کے کلام اور اہلِ نظر کی رایوں سے ان کے کلام میں جو نقائص ثابت ہوتی ہیں حسب ذیل ہیں۔

۱۔ ان کے تین ربع کلام کی زبان صاف و سادہ نہیں۔

۲۔ لغات و محاورات کی غلطیاں ہیں۔

۳۔ قواعدِ صرف و نحو کی خلاف ورزیاں ہیں۔

۴۔ کلام میں رکاکت و ابتذال ہے۔

۵۔ بعض اشعار مہمل ہیں۔

۶۔ الفاظ ثقیل و غریب لائے ہیں۔

۷۔ کلام میں اغلاق بہت ہے۔

۸۔ بیان و مضامین میں ناہمواری گنجلک و پیچیدگی و ژولیدگی ہے۔

۹۔ نالۂ و نوش اور ہائے ہو کے سوا دیگر قسم کے مضامین بہت کم اور غیر مؤثر ہیں۔

۱۰۔ اس قلیل مجموعہ میں جو ایک طومار سے منتخب کیا گیا ہے ایسی غزلیں اور اشعار بھی ہیں جن میں سوز و گداز اور تغزل نہیں۔

۱۱۔ زبان پر قدرت نہیں۔

یہ وہ نقائص ہیں جن کو غالب کے مداحوں سید علی حیدر نظم طباطبائیؔ

مولانا حسرت موہانی، آسی، آغا باقر، پروفیسر حامد حسن، شمس العلماء اثر نے تسلیم کیا ہے۔ مولانا حسرت موہانی نے اکثر اعتراضات کے متعلق یہ رائے ظاہر کی ہے کہ ان کا کوئی جواب نہیں ہو سکتا، یہ معائب ایسے سخت ہیں کہ دنیائے ادب میں اس سے زیادہ کوئی مجرم سنگین نہیں اور کسی طرح قابلِ معافی نہیں۔

شاعری میں صرف یہی نہیں دیکھا جاتا کہ شعر میں درد کس درجہ ہے، مضمون، تشبیہات کیسی ہیں۔ اول صحتِ لغات و درستیٔ زبان اور موافقتِ قواعدِ فن پر نظر کی جاتی ہے باقی باتیں بعد کی ہیں۔ اگر زبان و لغت و قواعد پر نظر نہ کی جائے تو اس قسم کے اشعار بھی قابلِ مدح قرار پائیں گے کیونکہ مضمون عمدہ ہے بحر شگفتہ ہے۔

عشق مذہب است و نہ شنوم پند
نہ ہستم مسلمان نہ ہستم گبسیر

اگر حسنِ الفاظ اور گلے بجانے کو دیکھا جائے تو یہ شعر بھی لائقِ ستائش ہے۔

مرکزِ محورِ گردوں بہ لبِ آب نہیں
ناخنِ قوسِ قزح شبہ مضراب نہیں

اہلِ علم و بصیرت کی نظر میں شاعری صرف سوز و گداز، شراب و کباب، ہائے ہو کا نام نہیں محض ان اوصاف کی بنا پر اہلِ نظر کسی شعر کی داد نہیں دے سکتے ہاں عوام میں ایسا کلام بہت مقبول و ممدوح ہوگا۔ مرزا غالب کی شاعری کی ایسی مثال ہے کہ ایک پری چہرہ، حسین گل اندام، دل ربا ہے۔ مگر کانا اور نکٹا ہے اگر کوئی دیکھنے والا اس کے چہرے پر نظر نہ کرے یا اس کے چہرے پر نقاب ڈال دیا جائے تو اس کے باقی اعضاء کا تناسب اور اس کا ناز و انداز ایسا ہے کہ دل کو قابو میں رکھنا دیکھنے والوں کے بس کی بات نہیں۔

مرزا غالب کی شاعری سے زبان و فن کو نقصان پہنچا انھوں نے ایسی زبان استعمال کی جو نہ فارسی تھی نہ اردو، اس طرح زبان کو بگاڑا۔ لغات و محاورات و قواعدِ فن کی

ایسی خلاف ورزیاں استعمال کیں کہ جس کی نظیر مشہور شعراء میں نہیں آج جس قدر بے محل و غلط الفاظ و تراکیب کے استعمال کرنے والے ہیں اور جتنے ضوابطِ فن و قواعدِ زبان سے نابلد ہیں اور جس قدر تنگ بند ہیں وہ سب غالب کا نام لیتے ہیں اور غالب کے کلام کو نظیر گردانتے ہیں۔

جب کوئی فتنہ زمانے میں نیا اٹھتا ہے
وہ اشارے سے بتادیتے ہیں تربت میری

میں اپنے اس بیان کی تائید میں چند ایک اہلِ نظر کی رائیں بھی پیش کرسکتا ہوں۔ رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں۔

"اچھا ہوا اس قسم کی زبان جس پر اس قدر فارسیت کا رنگ غالب تھا رواج پذیر نہ ہوئی"

اس قسم کے چند حوالے زبانِ غالب کے عنوان کے تحت میں آچکے ہیں۔ غالب کے خاص مداح مہر صاحب نے لکھا ہے۔

"جس طرح آج کل کور ذوق اصحاب نے فارسی اضافتوں کے مسرفانہ استعمال کو غالب کی پیروی سمجھ رکھا ہے"

یہ حوالہ بالتفصیل کہیں نقل کیا جاچکا ہے۔
پنڈت کیفی دہلوی لکھتے ہیں۔

"مرزا بیدل نے جو بیج بویا تھا وہ مرزا نوشہ کے ذہن میں پھوٹ نکلا۔ جس سے ان کے بعد آنے والوں میں اقبال سب سے زیادہ مسموم ہوئے"

یہ حوالہ بھی پہلے آچکا ہے۔ غرض ان کی شاعری نے ہماری زبان وادب کو نقصان پہنچایا ہے۔

خلاصہ محاسنِ کلامِ غالب

(۱) سوز و گداز خوب ہے۔

(۲) بعض تشبیہات و استعارات اعلیٰ ہیں۔
(۳) نالۂ و نوشِ حسرت و یاس کے مضامین کو اچھوتے پن کے ساتھ ادا کیا ہے۔
(۴) مہذب و متین و شوخ کلام ہے۔
(۵) اشعار ذو معنیین خوب ہیں۔
(۶) باوجود قلیل کلام کے ان کے اکثر اشعار علم مجلسی میں کارآمد ہیں۔
(۷) الفاظ حسین اور بندش چست ہے۔ یہ خوبی انھوں نے مرزا بیدل سے مستعار لی ہے۔[1]
(۸) رفعتِ تخیل و خوبی ادا کی مثالیں ان کے کلام میں بہت ہیں یہ زیادہ تر بیدل اور شعرائے ایران سے ماخوذ ہیں۔
(۹) غم و اندوہ کے مضامین ادا کرنے میں وہ یگانہ ہیں۔
(۱۰) ان کے دو ہزار اشعار میں سے پانچ سو اشعار ایسے ہیں جو اردو کے لیے اسی طرح مایۂ ناز ہیں جس طرح دیگر اساتذہ کا کلام۔

اُردو نثر

سادہ اردو اور سادہ خطوط لکھنے میں ان کو اولیت کا شرف تو حاصل نہیں لیکن تکثیر و اشاعت کا سہرا ان کے سر ہے۔ ان کے اردو خطوط نہایت صاف اور پُر لطف ہیں۔ وہ خطوط اس طرح لکھتے ہیں جیسے کوئی پاس بیٹھا باتیں کر رہا ہو۔ نگارش میں گذارش اور تحریر میں تقریر کا مزا آتا ہے، جملے چھوٹے چھوٹے اور نہایت برجستہ ہیں۔ باتیں نہایت واضح اور شیریں ہیں۔

تصانیف

اردو فارسی دونوں زبانوں میں وہ نظم و نثر میں بہت سی قابلِ قدر تصانیف کے مالک ہیں اور ایک خاص طرز کے موجد ہیں۔ ان کی تصانیف نہایت بلند پایہ

---

[1] غالب مصنفہ مہر ص ۴۵۹

اور مفید ہیں۔

تقریر

وہ اردو میں اچھی تقریر کرتے تھے۔ انھوں نے لٹریری سوسائٹی کے ایک جلسہ منعقدہ ۱۵ اگست ۱۸۶۵ء میں دہلی کی بربادی اور کمیِ بارش پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔

"حکام معدلت فرجام اور صاحبان عالی مقام کی جناب میں اور حاضرانِ انجمن ودانندگان ہر علم وفن کی خدمت میں، بلکہ جو شخص خدا پرست وحق شناس ہیں ان سے میرا التماس ہے کہ یاد کرو ۱۸۵۷ء میں دلی کے نادانوں نے حاکموں پر شہر کا دروازہ بند کر دیا تھا۔

یہ انجمن ۱۸۵۸ء کے بعد انگریزوں نے دہلی میں قائم کی تھی اس کے سکرٹری منشی پیارے لال تھے۔ ۱۸ ارنومبر ۱۸۶۰ء میں اس سوسائٹی کا ایک اجلاس میجر بیک موہن کی صدارت میں منعقد ہوا، لوگوں نے مرزا صاحب کی تقریر کی تعریف کی تھی۔

راقمِ سطور کی رائے

تمام معائب ومحاسن اور تذکرہ نویسوں اور مبصرین کی رایوں پر غور کرنے کے بعد یہ ثابت ہوتا ہے کہ مرزا غالب کے کلام کا زیادہ حصہ شاعری کے اعلیٰ صفات یعنی صحت وخوبیِ زبان وبیان ودرستیِ قواعد سے خالی ہے اور شاعری کے اعلیٰ فوائد یعنی پند وموعظت بھی ان کے کلام میں کم ہے۔ نائے ونوش ہائے ہو کے مضامین سے ان کا کلام لبریز ہے اس لئے ان کا کلام زبان وملک وقوم کے لئے مفید نہیں مضرت رساں ہے۔ گانے بجانے والوں، رندوں اور ہوسناکوں کے بہت کار آمد ہے۔

اگر صفائی وصحتِ زبان، درستیِ قواعد کا شعر میں پایا جانا ضروری ہے اور

بغیران اوصاف کے کسی شعر کو صحیح نہیں کہہ سکتے تو مرزا غالب اپنے معاصرین میں سب سے کم درجے کے شاعر ہیں۔ اور اگر اردو شاعری کا مدار و مفاد صرف داستانِ حُسن و عشق، شراب و کباب حُسنِ الفاظ، رفعتِ تخیل، درد و خستگی پر ہے تو مرزا غالب درد اور میر کے بعد سب سے بڑے شاعر ہیں۔ شاعری کا اعلیٰ مقصد و مفاد درستی زبان و فن اور ملک و قوم کی خدمت ہے۔ باقی امور اس کے بعد اور کم درجے کے ہیں۔ شاعری کے اعلیٰ مقاصد سے مرزا کا کلام تقریباً خالی ہے اس لئے وہ مسلم الثبوت اور بڑے اساتذہ میں شمار ہونے کا استحقاق نہیں رکھتے صرف اردو کے شاعر کہے جا سکتے ہیں اور اساتذہ معاصرین کے ساتھ ان کا نام بھی آ سکتا ہے۔

مقامِ غالب

مرزا غالب اردو شاعری کے اساتذہ میں سے ہیں لیکن وہ اس پایہ کے استاد نہیں کہ ان کو زبان و فن کے معاملہ میں سند قرار دیا جائے یا صاحبِ تصرف تسلیم کیا جائے وہ اردو شاعری کے اعتبار سے اپنے تمام معاصرین سے گھٹے ہوئے ہیں۔ مرزا غالب اردو کے شاعر، نثار اور مقرر ہیں۔ فارسی کے شاعر اور نثار ہیں چند مفید تالیفات کے مالک بھی ہیں اس لئے بحیثیت مجموعی وہ اپنے تمام معاصرین سے افضل ہیں اردو نثر و خطوط نویسی میں ان کا وہ مرتبہ ہے کہ ایسے سادہ پر لطف با مزا خط کسی نے نہیں لکھے۔

اردو شاعری میں وہ اپنے تمام معاصرین سے کم ہیں۔ ان کے قلیل عمدہ کلام ہی پر ان کو اساتذہ میں شمار کیا جاتا ہے۔ اردو شاعری میں وہ اس سے زیادہ قدر و مرتبہ کے مستحق نہیں اُن کے لئے یہی بہت بڑی بات ہے کہ ذوق و مومن کے ساتھ ان کا نام لیا جاتا ہے۔

بلبل ہمین کہ قافیۂ گل شود بس است

ایک شاعر، نثار اور مصنف ہونے کی حیثیت سے وہ ہر طرح واجب الاحترام ہیں اور اہلِ ہند کی طرف سے شکریہ اور دعا کے مستحق ہیں۔

مصادر

۱۔ غالب مصنفہ ڈاکٹر عبداللطیف مطبوعہ ۱۹۳۲ء دکن لا رپورٹ پریس

۲۔ غالب مصنفہ مولانا مہر مطبوعہ لاہور پہلا ایڈیشن ۱۹۴۱ء

۳۔ انتخاب مخزن کریمی پریس لاہور پہلا ایڈیشن

۴۔ رسالہ معارف اعظم گڑھ فروری ۱۹۴۵ء

۵۔ رسالہ نگار۔ لکھنؤ جنوری ۱۹۴۶ء جون ۱۹۳۸ء اپریل ۱۹۴۳ء ستمبر ۱۹۳۴ء
اکتوبر ۱۹۴۴ء اپریل ۱۹۴۵ء جون ۱۹۴۵ء مارچ ۱۹۲۷ء

۶۔ برہان۔ دہلی۔ جنوری ۱۹۴۵ء

۷۔ روحِ تنقید۔ مصنفہ ڈاکٹر زور مطبوعہ ۱۹۳۰ء ابراہیمیہ پریس دکن پہلا ایڈیشن

۸۔ آبِ حیات مصنفہ محمد حسین آزاد شیخ مبارک علی لاہور

۹۔ رسالہ ہندوستانی الہ آباد جنوری ۱۹۳۴ء

۱۰۔ نکاتِ غالب مطبوعہ نظامی پریس بدایوں پہلا ایڈیشن ۱۹۲۰ء مصنفہ نظامی بدایونی

۱۱۔ ذکرِ غالب۔ مالک رام مکتبہ جامعہ دہلی ۱۹۵۵ء پہلا ایڈیشن

۱۲۔ رسالہ آجکل دہلی سالنامہ ۱۹۴۷ء

۱۳۔ سروِ آزاد مصنفہ آزاد بلگرامی باراول مطبوعہ ہندوستان

۱۴۔ تذکرہ گلزارِ ابراہیم میرزا علی ۱۹۳۴ء

۱۵۔ کاشف الحقائق مصنفہ امداد اثر مطبوعہ کارونیشن پریس لکھنؤ پہلا ایڈیشن

۱۶۔ رموزِ غالب مطبوعہ گیلانی الیکٹرک پریس لاہور ۱۹۳۵ء دوسرا ایڈیشن

۱۷۔ گلستان بے خزاں۔ نولکشور پریس لکھنؤ ۱۸۷۵ء باراول مصنفہ میر قطب الدین

۱۸۔ عیار الشعراء مصنفہ خوب چند ذکا

۱۹۔ احسن الانتخاب پہلا ایڈیشن۔ یونیورسٹی پریس علی گڈھ۔ مصنفہ احسن مارہروی

۲۰۔ مرأۃ الغالب۔ مصنفہ بیخود دہلوی مطبوعہ محبوب المطابع دہلی ۱۹۲۳ء باراول

۲۱۔ اردوئے معلیٰ، غالب اکمل المطابع دہلی
۲۲۔ تاریخ نظم مرتبہ سیماب مطبوعہ تاج بک ڈپو۔ لاہور پہلا ایڈیشن ۱۹۳۷ء
۲۳۔ شعرالعجم مصنفہ شبلی۔ نگینہ اسٹیم پریس لاہور
۲۴۔ کیفیہ مصنفہ پنڈت کیفی مطبوعہ دہلی پہلا ایڈیشن
۲۵۔ اردو شاعری پر ایک نظر مصنفہ کلیم الدین احمد مطبوعہ قومی پریس بانکی پور پہلا ایڈیشن
۲۶۔ رسالہ شباب اردو لاہور مئی، جون، اگست ۱۹۲۱ء
۲۷۔ تاریخ ادب رام بابو سکسینہ مطبوعہ نول کشور پریس ۱۹۲۹ء پہلا ایڈیشن
۲۸۔ گلِ رعنا حکیم عبدالحی مطبوعہ معارف اعظم گڈھ طبع ثانی ۱۳۵۳ھ
۲۹۔ شعرالہند مصنفہ عبدالسلام ندوی مطبوعہ اعظم گڈھ پہلا ایڈیشن ۱۹۳۲ء
۳۰۔ مرآۃ الشعراء مصنفہ یحییٰ تنہا مطبوعہ شیخ مبارک علی لاہور
۳۱۔ مرآۃ الشعر مصنفہ عبدالرحمن جید برقی پریس دہلی ۱۹۲۶ء بار اول
۳۲۔ تاریخ نظم و نثر اردو عالم گیر پریس لاہور مطبوعہ ۱۹۴۲ء طبع سوم
۳۳۔ نقد و نظر مصنفہ حامد حسن قادری مطبوعہ اخبار برقی پریس ۱۹۴۲ء آگرہ
۳۴۔ شرح دیوانِ غالب طباطبائی مطبوعہ انوار بک ڈپو لکھنؤ ۱۹۵۴ء
۳۵۔ محاسنِ کلام غالب بجنوری مرحوم مطبوعہ ۱۹۳۵ء انجمن ترقی اردو علی گڈھ
۳۶۔ رسالہ اردو اورنگ آباد جون ۱۹۲۱ء جنوری، اپریل ۱۹۲۲ء
۳۷۔ آثارِ غالب مصنفہ محمد اکرم پہلا ایڈیشن مرکنٹائل پریس لاہور
۳۸۔ مدراس میں اردو مصنفہ نصیرالدین غنی مطبوعہ مکتبہ ابراہیمیہ دکن ۱۹۳۶ء
۳۹۔ سیرالمصنفین یحییٰ تنہا مطبوعہ محبوب المطابع دہلی ۱۹۲۴ء
۴۰۔ جدید اردو شاعری مرکنٹائل پریس مطبوعہ لاہور ۱۹۳۹ء مصنفہ عبدالقادر سروری
۴۱۔ رسالہ عالمگیر لاہور خاص نمبر نومبر ۱۹۴۴ء
۴۲۔ رسالہ مشہور دہلی اپریل ۱۹۴۳ء
۴۳۔ مقدمہ شعر و شاعری حالی مطبوعہ بار اول دہلی

۴۴۔ حدیقۂ صارم عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور ۱۹۳۴ء مصنفہ مولانا عبدالمجید

۴۵۔ تذکرۃ البلاغت مصنفہ ذوالفقار علی مطبوعہ مجتبائی بار اول سنہ ۱۹۱۰ء

۴۶۔ مجموعۂ استفسارات نیاز فتحپوری مطبوعہ مختار ورکس جلد دوم لکھنؤ ۱۹۳۵ء
بار اول حصہ اول ۱۹۳۴ء

۴۷۔ مخزنِ ادب سر عبدالقادر فیروز سنز لاہور

۴۸۔ بیانِ غالب مصنفہ آغا باقر مطبوعہ عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور بار اول ۱۹۴۰ء

۴۹۔ تذکرہ معرکۂ سخن نگار بک ایجنسی لکھنؤ ۱۹۳۲ء مصنفہ اسیر لکھنوی

۵۰۔ فیض اللغات مطبوعہ لاہور ۱۹۳۵ء پہلا ایڈیشن

۵۱۔ مخزن القوافی مطبوعہ محبوب پریس حیدرآباد دکن ۱۳۲۷ھ

۵۲۔ نور اللغات مطبوعہ نیر پریس لکھنؤ پہلا ایڈیشن ۱۹۲۴ء مصنفہ نور الحسن نیر۔

۵۳۔ شرح دیوان غالب حسرت موہانی اکتوبر ۱۹۳۹ء مطبوعہ علی گڈھ طبع دوم

۵۴۔ رموزِ غالب احسان بن دانش

۵۵۔ اردو کا سب سے بڑا شاعر اور محسن مصنفہ صارم مطبوعہ انتظامی پریس حیدرآباد دکن
۱۹۴۳ء پہلا ایڈیشن

۵۶۔ سرگزشت غالب ابراہیمیہ پریس حیدرآباد دکن مطبوعہ ۱۹۳۹ء

۵۷۔ رسالہ جوہر جامعہ ملیہ دہلی عبدالحق نمبر ۱۹۴۰ء

۵۸۔ غالب شکن مصنفہ یگانہ چنگیزی طبع ثانی ۱۹۳۵ء آرمی پریس دیال باغ آگرہ

۵۹۔ رسالہ ہمایوں لاہور اکتوبر ۱۹۳۵ء

۶۰۔ نیرنگِ خیال لاہور جولائی ۱۹۲۶ء

۶۱۔ رسالہ ایشیا بمبئی مارچ ۱۹۴۳ء

۶۲۔ اورینٹل کالج میگزین لاہور نومبر ۱۹۳۹ء

۶۳۔ شرح دیوانِ غالب شوکت تھانوی

۶۴۔ رسالہ آئینۂ فیض محبوب المطابع ۱۳۱۲ھ

۶۵۔ انتقادیات مطبوعہ عہد آفریں پریس حیدر آباد دکن ۱۹۴۲ء مصنفہ نیاز فتحپوری
۶۶۔ سخندانِ فارس محمد حسین آزاد مطبوعہ گلاب سنگھ لاہور
۶۷۔ گلستانِ سخن مصنفہ اسیر مطبوعہ نولکشور لکھنؤ ۱۸۶۴ء
۶۸۔ عودِ ہندی از غالب مبارک علی لاہور
۶۹۔ تذکرہ از شیخ مصحفی انجمن ترقی اردو دہلی ۱۹۳۴ء
۷۰۔ مضامین چکبست ۱۹۴۰ء انڈین پریس۔
۷۱۔ شمعِ انجمن۔ شاہ جہانی پریس بھوپال ۱۲۹۳ھ
۷۲۔ تنقیداتِ عبدالحق بار اول ۱۹۳۹ء انجمن ترقی اردو
۷۳۔ یادگارِ غالب از حالی طبع دوم مفید عام پریس علی گڑھ
۷۴۔ اخبار ہماری زبان دہلی اپریل ۱۹۴۵ء
۷۵۔ مضامینِ شرر عبدالرشید اینڈ برادر لاہور ۱۹۳۵ء پہلا ایڈیشن
۷۶۔ ہماری شاعری مسعود حسن پہلا ایڈیشن نظامی پریس بدایوں
۷۷۔ جلوۂ خضر محمد صفیر بلگرامی مطبوعہ نورالانوار ۱۳۰۲ھ
۷۸۔ تاریخ و تنقید ادبیات اردو آگرہ برقی پریس ۱۹۲۹ء مصنفہ حامد حسن قادری
۷۹۔ حجۃ اللہ البالغہ شاہ ولی اللہ مطبوعہ قاہرہ ۱۳۲۲ھ
۸۰۔ داستان تاریخِ اردو مصنفہ حامد حسن قادری مطبوعہ عزیزی پریس آگرہ بار دوم ۱۹۵۷ء
۸۱۔ انشائے بے خبر سید مرتضیٰ حسین بلگرامی مطبوعہ ادبی دنیا علی گڑھ ۱۹۴۶ء
۸۲۔ خطوطِ غالب نسخہ مہیش داس
۸۳۔ تاریخ ادبیاتِ ایران مصنفہ ڈاکٹر براؤن مطبوعہ انجمن ترقی اردو دہلی پہلا ایڈیشن ۱۹۳۹ء
۸۴۔ شرح دیوانِ غالب مصنفہ مولانا سہا

۸۵ ۔ انتخاب غالب اقبال اکیڈیمی لاہور ۱۹۴۳ء
۸۶ ۔ افکار غالب مصنفہ خلیفہ عبدالحکیم مطبوعہ لاہور معین الادب ۱۹۵۴ء
۸۷ ۔ علی گڈھ کالج میگزین غالب نمبر ۱۹۵۰ء
۸۸ ۔ لکھنؤ کا دبستان شاعری مصنفہ ڈاکٹر ابواللیث مطبوعہ علی گڈھ ۱۹۴۴ء بار اول
۸۹ ۔ گل کدہ نواب عزیز یار جنگ اعظم سٹیم پریس دکن
۹۰ ۔ رسالہ الاصلاح اعظم گڈھ اکتوبر ۱۹۳۶ء
۹۱ ۔ مجلہ طیلسانیین حیدر آباد دکن مارچ ۱۹۴۳ء

مصنّف

میں اپنے حالاتِ زندگی، نام ونسب اور سکونت وملازمت وغیرہ کے بارے میں تفصیل کے ساتھ اپنی مختلف تصانیف میں لکھ چکا ہوں لہٰذا یہاں ان باتوں کے اعادے کی ضرورت نہیں۔

قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے ایک بھائی اٹھے تو انھوں نے غالب کو آسمان پر چڑھا دیا اور اب دوسرے بھائی نے قلم اٹھایا تو غالب کا بیڑا غرق کر دیا۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری میرے بہت قریبی عزیز، ہم وطن اور پڑوسی تھے۔ ہم دونوں ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔

اردو شاعری سے ہماری دلچسپی اس طرح ہوئی کہ جس زمانے میں ہم دیوبند میں بغرضِ تعلیم تھے تو وہاں شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی کی نگرانی میں دے دیئے گئے۔ پہلے منطق و فلسفہ سے دلچسپی تھی مگر اس خصوصیت کی وجہ سے ادبِ عربی سے دلچسپی ہو گئی۔ جب ان کی مہربانی سے عربی لکھنا آگئی تو جی میں آئی کیوں نہ عربی شاعری پر بھی ہاتھ صاف کر دیا جائے، گو عربی میں تخلص کا رواج نہیں ہے مگر ہندوستانی ماحول کے زیرِ اثر تخلص ڈھونڈنا ہی پڑا۔ اس زمانے میں بہادری سے بہت دلچسپی تھی اور حضرت قبلہ والد صاحب قاضی ظہور الحسن ناظم کے تخلص پر تخلص رکھنے کی خواہش ہوئی۔ بچپن سے افتادِ طبع کچھ ایسی ہے کہ عام بات بھاتی نہیں، لہٰذا المنجد لے کر ناظم کے وزن پر الفاظ کی تلاش شروع کر دی۔ نگاہِ انتخاب صارم پر پڑی۔

جب عربی شاعری آگئی تو ہم نے سوچا کیوں نہ فارسی شاعری کی بھی گت بنائی جائے چنانچہ فارسی شاعری شروع کر دی۔ جب دیکھا کہ یہاں بھی راہوارِ طبع چلنے لگا تو اردو

شاعری کی طرف قدم بڑھایا۔

اورینٹیل کالج لاہور کی ایک شاخ جامع مسجد فتحپوری دہلی میں تھی۔ فاضل دیوبند ہو جانے کے بعد ادھر کا رُخ کیا اور دہلی پہنچے تو حضرت سائل کے اور پھر بیخود کے شاگرد ہو گئے پھر اگلے سال حیدر آباد دکن جانا پڑا تو حضرت جلیل کے شاگرد بن گئے اور جب پنجاب آئے تو خواجہ دل محمد کے حلقہ تلمذ میں اپنے آپ کو داخل کر لیا۔

اس طرح اردو ادب سے دلچسپی چلی آتی ہے۔ میں چاہتا تھا کہ ڈاکٹر طہٰ حسین کی تنقیدات کا جواب لکھوں للہ نے وہ تو پورا کر دیا پھر غالب پر بھی کچھ لکھنا چاہتا تھا یہ کام بھی ہو گیا۔ کیا کروں عربی اور مذہبی و علمی کتابیں ادھر کم رخ کرنے دیتی ہیں میں چاہتا ہوں کہ تنقیدات عبدالحق پر بھی کچھ لکھوں کیوں کہ مولانا عبدالحق اور موجودہ دور کے عربی و فارسی سے کچھ زیادہ تعلق نہ رکھنے والے پروفیسروں، مصنفوں، نقادوں اور مضمون نگاروں نے بہت سی غلط باتیں لکھدی ہیں اور بہت سی غلط باتوں کو رواج دے دیا ہے جن پر ایک عربی داں اور مخصوص فارسی قابلیت رکھنے والا اعتراض کی گنجائش محسوس کرتا ہے۔ اگر یہ لوگ پورے طور پر عربی داں ہوتے تو شاید ایسی اغلاط نہ کرتے، غلطیاں تھوڑی سی عربی دانی کی وجہ سے بھی پیدا ہو گئی ہیں اور کچھ ایسے اہلِ قلم ہیں جنہوں نے یہ دیکھ کر کہ فلاں لفظ یا فلاں ترکیب عربی قاعدے سے درست نہیں بیٹھتی۔ لہٰذا ان الفاظ یا ان ترکیبوں پر اعتراضات کر دیئے ہیں۔ حالاں کہ وہ الفاظ اور وہ ترکیبیں گو اصل کے اعتبار سے عربی و فارسی سہی لیکن دراصل اردو کا سرمایہ ہیں اور اسی طرح درست ہیں دیکھئے موقعہ ہاتھ آیا تو قلم اٹھاؤں گا۔

عبدالصمد صارم

۱ اپریل ۱۹۶۰ء

یادداشت

البشائر | مطبوعہ مصر قیمت پچاس پیسے۔ اس کتاب میں وید وغیرہ ہندوستانی کتابوں سے رسول اللہ کی آمد کے متعلق بشارات ہیں۔ علامہ طنطاوی جوہری نے اسے پسند کیا ہے۔

استاذ العربیہ | عربی مڈل کورس قیمت تین روپیہ۔ چار حصے۔ اس کا ایک حصہ عربی صرف ونحو پر ہے منظور شدہ گورنمنٹ۔

عربی کی پہلی کتاب | مڈل کورس۔ قیمت پچھتر پیسے۔ منظور شدہ گورنمنٹ۔

فارسی تصانیف

فارسی آموز | تین حصے باتصویر، غیر مجلد۔ قیمت چھ روپیہ یہ ابتدائی کورس ہے۔

محمود و فردوسی | اس موضوع پر اس سے بہتر کتاب نہیں لکھی گئی، علمائے ایران وکابل نے پسند کی قیمت دو روپیہ

انتخاب فارسی | نظم و نثر فارسی کا انتخاب قیمت دس روپیہ

اردو تصانیف

تاریخ القرآن | یہ کتاب تیسری بار چھپ چکی ہے۔ مصر، شام اور یورپ کے مصنفین نے اس کتاب کے حوالے اپنی تصانیف میں دیئے ہیں۔ مصنف نے نزولِ قرآن سے لے کر آج تک کے حفاظ، مفسرین، تصانیف و رجال وغیرہ کا بغیر کسی تعصب کے ہر مسلک و ملک کے علماء کے حالات درج کئے ہیں۔ وحی و قرآن سے متعلق جتنے بھی چھوٹے بڑے

مباحث ہو سکتے ہیں وہ سب اس کتاب میں آگئے ہیں حضرت عمرؓ کے دست مبارک کے لکھے ہوئے قرآن مجید مصحف قرآنی، مصحف علیؓ اور مصحف قدیم بخط کوفی کے فوٹو شامل کتاب ہیں۔ طباعت وکتابت دیدہ زیب مجلد گرد پوش صفحات ۳۰۰ ہدیہ ساڑھے چھ روپیہ۔

ایم۔ اے عربی، فاضلِ عربی اور ایم اے اسلامیات کے اساتذہ اور طلبہ عموماً اسی کتاب کا مطالعہ کرتے ہیں۔ منظور شدہ گورنمنٹ۔

تاریخ الحدیث

تیسری بار چھپ چکی ہے۔ مصر، عراق و شام اور یورپ کے مصنفین نے اس کتاب کے حوالے اپنی تصانیف میں دیئے ہیں۔ دورِ رسالت سے اب تک کے تمام کوائف ومباحث تصانیف و رجالِ حدیث کا مکمل ومفصل ذکر ہے۔ طباعت وکتابت دیدہ زیب، مجلد، گرد پوش۔ قیمت ساڑھے چھ روپیہ۔ صفحات ۳۰۰۔ مذکورہ بالا امتحانات کے لئے مفید ہے۔ منظور شدہ گورنمنٹ۔

تاریخ الفقہ

تیسری بار چھپ چکی ہے۔ ملکی اور غیر ملکی مصنفین نے اس کتاب کے حوالے اپنی تصانیف میں دیئے ہیں مندرجہ بالا امتحانات کے لئے مفید ہے۔ صفحات ۱۷۶۔ کتابت وطباعت دیدہ زیب۔ مجلد۔ قیمت چار روپیہ۔ سفید کاغذ

تاریخ التفسیر

کتاب میں حضرت امام حسنؓ کے دست مبارک کے قرآن کا نمونہ اور دو نایاب ترجمہ قرآن کے نمونے اور اس قرآن کا فوٹو شامل ہے جو پاکستان میں سونے، چاندی کے تاروں سے لکھا جا رہا ہے۔ تیسری بار چھپ چکی ہے۔ ملکی و غیر ملکی مصنفین نے اس کتاب کے حوالے اپنی تصانیف میں دیئے ہیں۔ عہدِ رسالت سے لے کر اب تک کے تمام مفسرین وتفاسیر وتراجم کا ذکر ہے۔ قیمت مجلد چھ روپیہ صفحات ۱۶۰

اللّٰہ
مصر کے شہرۂ آفاق مصنف عباس محمود العقاد کی شہرۂ آفاق تصنیف اللہ کا ترجمہ۔ اردو میں اس سے بہتر تصنیف اس عنوان پر نہیں ہوئی۔ صفحات ۱۰۲۔ کتابت وطباعت اعلیٰ مجلد گردپوش ہدیہ آٹھ روپیہ پچاس پیسے

قصص القرآن
ایران کے مشہور مصنف علامہ صدرالدین بلاغی کی کتاب کا ترجمہ۔ تمام قرآنی قصوں کو ناولانہ رنگ میں پیش کیا گیا ہے اور خوبی یہ کہ کوئی بات بھی قرآن سے باہر نہیں گئی۔ ہدیہ آٹھ روپیہ پچاس پیسے۔ مجلد گردپوش کتابت وطباعت اعلیٰ صفحات ۳۴۴

قرآنی اخلاق
آیات قرآنی سے اخذ کی ہوئی اچھی اور بری عادتوں کا بیان، نہایت آسان فہم، چوتھا ایڈیشن طبع ہو چکا ہے۔ قیمت مجلد ایک روپیہ پچاس پیسے صفحات ۱۱۲

جواہر علوم قرآنی
علامہ طنطاوی جوہری کی شہرۂ آفاق تصنیف التاج المرصع کا ترجمہ۔ داخل فاضل عربی۔ سیکنڈری بورڈ لاہور۔ قیمت چار روپیہ۔ مجلد گردپوش صفحات ۲۵۶

شعر العرب
امام ابن قتیبہ کی مشہور عالم کتاب الشعر والشعراء ہر دو جلد کا مکمل ترجمہ۔ داخل ایم اے۔ عربی کورس۔ پنجاب یونیورسٹی۔ قیمت غیر مجلد آٹھ روپیہ۔ مجلد دس روپیہ۔

المنجد
شہرۂ آفاق عربی ڈکشنری کا اردو ترجمہ۔ مجلد گردپوش قیمت بتیس روپیہ

تاریخ تصوف
زیر طبع۔ قیمت دس روپیہ صفحات ۵۰۰

ادارہ علمیہ ۵ دھنی رام روڈ۔ انارکلی۔ لاہور

روح اور روحانیات
زیر طبع۔ قیمت دس روپیہ صفحات ۵۰۰

تنقیداتِ طٰہٰ حسین
مجلد، مطبوعہ ٹائپ۔ گرد پوش۔ قیمت چار روپیہ پچاس پیسہ۔ شعرائے دورِ جاہلی پر طٰہٰ حسین کی تنقیدات اور ان کا رد۔ اردو ادب میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ صفحات ۲۵۸

سفرنامۂ صارم
مصر، شام، فلسطین، عراق و ایران، کے چشم دید حالات۔ قیمت مجلد ۵/۵۰ روپیہ۔ اس سفرنامہ میں ۱۹۴۰ء کے حالات ہیں۔ صفحات ۱۶۰

سفرنامۂ حج و زیارت
مصر، شام، فلسطین، عراق، ایران، اور حجاز و عمان کے چشم دید حالات۔ مع احکاماتِ حج و جملہ معلوماتِ حج۔ قیمت تین روپیہ۔ صفحات ۲۴۲۔ اس سفرنامہ میں ۱۹۵۶ء کے حالات ہیں۔

خانۂ کعبہ
خانۂ کعبہ کی مکمل تاریخ۔ شروع سے لے کر اب تک کے حالات۔ حجاج کے لیے تحفہ ہے۔ قیمت ایک روپیہ پچھتر پیسہ۔ علامہ طاہر الکردی کی کتاب مقامِ ابراہیم کا ترجمہ۔ صفحات ۲۷۶۔ سستا ایڈیشن۔

رابعہ بصری
وداد سکاکینی (مصری) کی کتاب کا سلیس اردو ترجمہ۔ قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے۔ سستا ایڈیشن صفحات ۱۳۲۔ تیسرا ایڈیشن چھپ چکا ہے۔ مجلد ڈھائی روپیہ۔

امیر معاویہ
زکریا الصوفی کی کتاب کا ترجمہ سستا ایڈیشن قیمت ایک روپیہ پچیس پیسے۔ صفحات ۹۶

عمر بن عبدالعزیز | ترجمہ کتاب احمد زکی صفوت صفحات ۸۰۔ سستا ایڈیشن قیمت ایک روپیہ پچیس پیسے۔

امام زین العابدین | ترجمہ عبدالعزیز سید الاہل صفحات ۹۶۔ قیمت ایک روپیہ پچیس پیسے۔ سستا ایڈیشن۔

ابوذر غفاری | ترجمہ کتاب عبدالحمید جودۃ السحار سستا ایڈیشن قیمت غیر مجلد دو روپیہ صفحات ۲۰۲ مجلد تین روپیہ

سیرت عثمان | ترجمہ تصنیف محمد رضا مصری قیمت چار روپیہ صفحات ۳۸۸
ترجمہ تصنیف محمد احمد جاد مولی بک قیمت تین روپیہ صفحات ۱۸۷

سیرتِ فاروقؓ۔ ترجمہ تصنیف ناجی عراقی دعمر و ابن عمر، زیرِ طبع۔

سیرتِ ابوبکر۔ ترجمہ کتاب محمد رضا مصری زیرِ طبع۔

صدائے کروان | ترجمہ دعاء الکروان۔ ناول طٰہٰ حسین مصری مع اصل و ترجمہ داخل کورس، ایم اے عربی۔ قیمت چھ روپیہ

تخلیقِ ادب و تنقید | تلخیص، و ترجمہ لٹریچر اینڈ کریٹیسزم مصنفہ ایچ کومبز مع ترجمہ اپریسیشن آف پوئٹری داخل کورس ایم اے اردو پنجاب یونیورسٹی قیمت ایک روپیہ پچیس پیسے۔

انتخابِ تاریخ۔ پانچ روپیہ منظور شدہ گورنمنٹ
مقالاتِ صارم۔ دو روپیہ
مضامینِ صارم۔ دو روپیہ
تاریخ کشمیر۔ پانچ روپیہ
اردو کا سب سے بڑا شاعر۔ دو روپیہ
خلقِ مسلم۔ پانچ روپیہ
زرِ خالص۔ تین روپے ۵۰ پیسے
اردو قواعد و انشا۔ پانچ روپے

زبان و قلم۔ دو روپے
عقائد الاحناف۔ پچیس پیسے
سیرتِ عائشہ۔ زیرِ طبع
الدر المکنون۔ پچاس پیسے
اربعین اعظم۔ پچاس پیسے
اردو زبان اور رسالہ۔ ایک روپیہ پچیس پیسے
ایمان و عمل۔ ایک روپیہ
خدائی نشانیاں۔ ایک روپیہ

بچوں کے لئے پاکیزہ ادب، بڑے لوگوں
کی سوانح حیات اور قرآنی قصے، ناولوں
سے زیادہ دل چسپ اور عبرت آموز، عام فہم
اور آسان اردو۔

بچّوں کی کتابیں

نامور بیٹیاں .... ایک روپیہ منظور شدہ گورنمنٹ

رسول کی تعلیم .... ایک روپیہ " "

تعلیماتِ اسلام ...... ۶۶ پیسے " "

اخلاقی کہانیاں .... ۳۶ پیسے " "

قاعدہ یسرنا القرآن ..... ۳۹ پیسے " "

ہماری زبان .... ۸۱ پیسے " "

سودیشی اردو .... ۵۰ پیسے

ضروری کہانیاں .... ۵۰ پیسے

خُلقِ عظیم .... منظوم ..... ۵۰ پیسے

اسلامی کتاب .... تین روپے

ادارہ علمیہ ۲۵ دھنی رام روڈ۔ نئی انار کلی۔ لاہور

منظور شدہ مطابق سرکلر ۱۸۶/۶۱، ای، ڈی، این، ڈی ای، ک رک مورخہ ۲۲ جولائی ۱۹۵۹ء

منظور شدہ مطابق سرکلر ڈی بی سی ۴۸۰۴-۴۴۰۴۴- ڈی ای پ رپ مورخہ ۱۴ اکتوبر ۱۹۵۹ء

کتاب	روپے	پیسے
اسلامی تاریخی کہانیاں حصہ اول	۱	۲۵
" " حصہ دوم	۱	۵۰
" " حصہ سوم	۱	۷۵
تاریخی کہانیاں	۱	۲۵
اچھی کہانیاں	۱	۰
سیرتِ امام اعظم	۰	۷۵
سیرتِ امام شافعی	۰	۶۲
سیرتِ امام حنبل	۰	۷۵
سیرتِ امام مالک	۰	۶۲
سیرتِ امام بخاری	۰	۶۲
ابنِ خلدون		۶۲
ابراہیم ادھم		۶۲
حسن بصری	۰	۷۵
رابعہ بصری	۰	۷۵
حاجی امداد اللہ	۰	۷۵
قاسم نانوتوی	۰	۵۶
اشرف علی تھانوی	۰	۷۵
انور شاہ کشمیری	۰	۷۵
شاہ عبدالعزیز	۰	۵۶
رشید احمد گنگوہی	۰	۷۵
شیخ الہند	۰	۷۵
حسین احمد مدنی	۰	۷۵
شبیر احمد عثمانی	۱	۲۵

ادارہ علمیہ ۳۰ دھنی رام روڈ۔ نئی انارکلی۔ لاہور

منظور شدہ مطابق سرکلر نمبر ڈی ای جی پی یو بی

(۱۴۶۷-۵۶۶ — ۶۳)

مورخہ ۱۷ جنوری ۱۹۶۲ء ڈی ای کے رکے

مغربی پاکستان

حضرت خدیجہ	۷۵ پیسے	شاہ ولی اللہ	۷۵ پیسے
عائشہ صدیقہ	۷۵ ،،	جمال الدین افغانی	۷۵ ،،
فاطمۃ الزہراء	۷۵ ،،	سید احمد شہید	۷۵ ،،
زینب بنت فاطمہ	۷۵ ،،	محمد عبدہٗ	۷۵ ،،
امام حسن	۷۵ ،،	عبید اللہ سندھی	۷۵ ،،
امام زین العابدین	۷۵ ،،	مولانا الیاس	۷۵ ،،
امام ابن قیم	۷۵ ،،	جمال عبد الناصر	۷۵ ،،
امام رازی	۷۵ ،،	اسماعیل شہید	۷۵ ،،
امام ابن تیمیہ	۷۵ ،،	شکر نعمت	۷۵ ،،
مولانا روم	۷۵ ،،	قاضی عزالدین	۷۵ ،،
فرید الدین عطار	۷۵ ،،	جمہ تیغ عابد	۷۵ ،،
حافظ شیرازی	۷۵ ،،	**قرآنی قصے**	
حیات سعدی	۷۵ ،،	حضرت آدم ؑ	۷۵ ،،

ادارہ علمیہ ۸ دھنی رام روڈ ۔ نئی انار کلی ۔ لاہور

حضرت نوحؑ	۵؍ پیسے
حضرت ہودؑ	۵؍ ،،
حضرت صالحؑ	۵؍ ،،
حضرت یوسفؑ	۵؍ ،،
حضرت ابراہیمؑ	۵؍ ،،
حضرت اسماعیلؑ	۵؍ ،،
حضرت ذوالقرنینؑ	۵؍ ،،
طالوت جالوت	۵؍ ،،
زلیخا	۵؍ ،،
حضرت موسیٰؑ اور خضرؑ	۵؍ ،،
حضرت داؤدؑ	۵؍ ،،
ہابیل قابیل	۵؍ ،،
حضرت عزیرؑ	۵؍ ،،
حضرت ایوبؑ	۵؍ ،،

قارون	۵؍ پیسے
سدرۃ المنتہیٰ	۵؍ ،،
اصحاب القریہ	۵؍ ،،
عام الفیل	۵؍ ،،
بنی اسرائیل کی گائے	۵؍ ،،
اصحاب الفیل	۵؍ ،،
معراج شریف	۵؍ ،،
اصحاب کہف	۵؍ ،،
اصحاب الاخدود	۵؍ ،،
ملکۂ سبا	۵؍ ،،
زمزم	۵؍ ،،
آل فرعون کا ایک مومن	۵؍ ،،
بنو اسرائیل	۵؍ ،،

ادارہ علمیہ ۵ دھنی رام روڈ نئی انارکلی ۔ لاہور

ہمارے یہاں سے

ہر قسم کی ادبی، درسی، طبی، مذہبی وغیر مذہبی، علمی، اردو، فارسی، عربی، مصر اور دیگر ممالک کی کتابیں دستیاب ہو سکتی ہیں۔

ادارہ علمیہ دھنی رام روڈ

نئی انارکلی

لاہور

قائم شدہ سنہ ۱۹۳۰ء